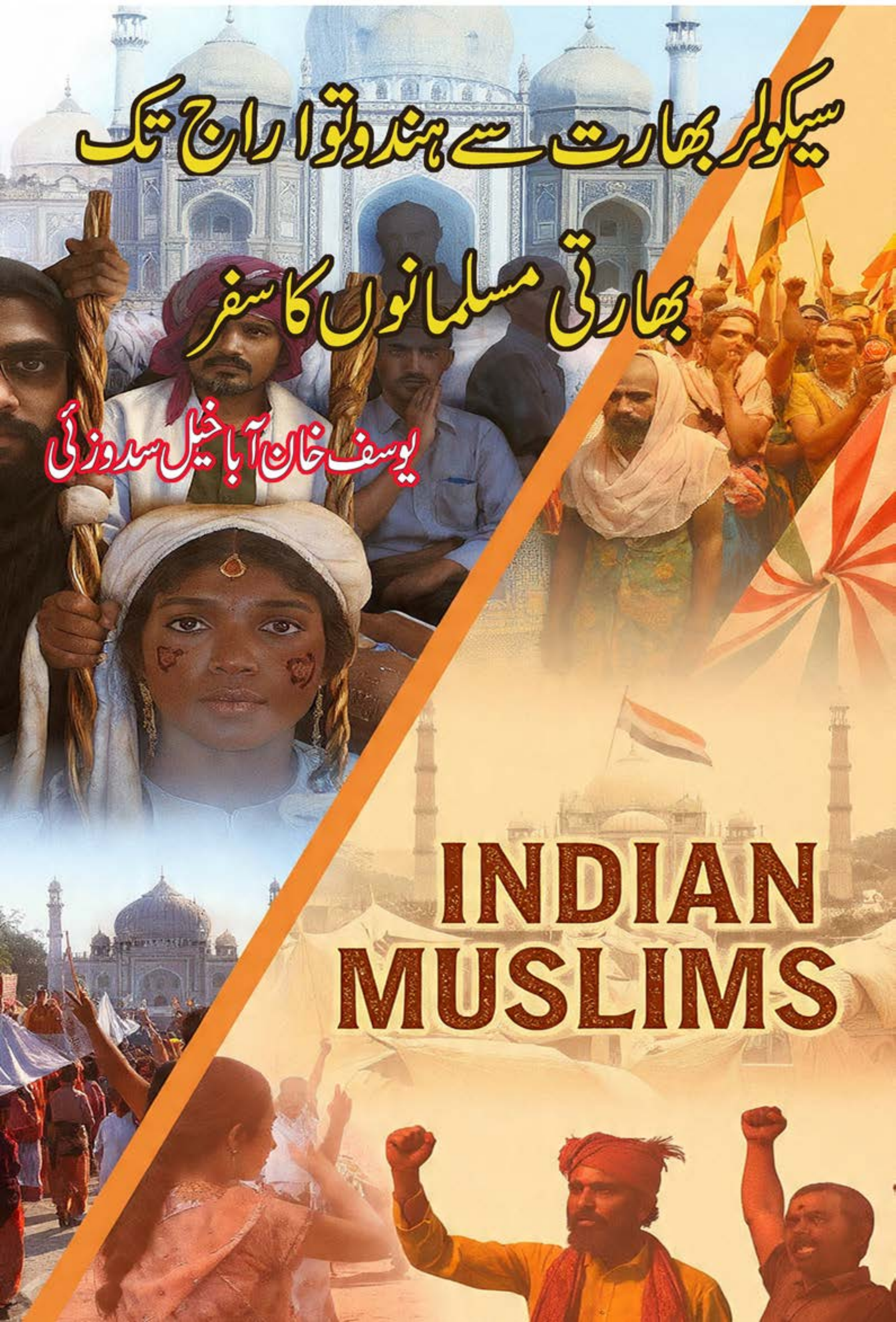

سیکولر بھارت سے ہندوتوا راج تک
بھارتی مسلمانوں کا سفر
یوسف خان آباخیل سدوزئی
INDIAN MUSLIMS

سیکولر بھارت سے ہندوتوا راج تک:
بھارتی مسلمانوں کا سفر

مصنف: یوسف خان آباخیل سدوزئی

سیکولر بھارت سے ہندوتواراج تک
بھارتی مسلمانوں کا سفر

جملہ حقوق بہ حق مصنف محفوظ ہیں

مصنف	-------	یوسف خان آباخیل سدوزئی
ناشر	-------	یوسف خان
قیمت	-------	500روپے
ٹائٹل	-------	منیب افتخار
ڈیزائننگ	-------	شاکر ظہیر
اشاعت اول	-------	جنوری 2026

رابطہ نمبر

00966-582098106

Email:yousafkhanabakhelsadozai@gmail.com

انتساب

یہ کتاب میرے بڑے بھائی— سردار منصور خان آبا خیل سدوزئی کے نام جن کی شفقت نے ہر کٹھن لمحے میں مجھے سہارا دیا اور جن کی مہربانی نے اس فکری و عملی سفر کے راستے میرے لیے ہموار کیے۔ ایک شفیق بھائی کی حیثیت سے انہوں نے حوصلہ، رہنمائی اور اعتماد کی ایسی روشنی بخشی جو اندھیروں میں بھی راہ دکھاتی رہی۔ ان کی موجودگی نے بوجھ کو ہلکا اور ارادوں کو استحکام عطا کیا۔ یہ کتاب ان کی بے لوث محبت، خاموش قربانیوں اور اس رشتے کے اعتراف میں ہے جو مشکل گھڑی میں سایہ اور کامیابی کے لمحے میں دعا بن کر ساتھ رہتا ہے۔

فہرست

1	مقدمہ	5
2	باب اوّل:۔ آزادی، شناخت اور ریاست کا پہلا امتحان	11
3	باب دوم:۔ اکثریت، قومیت اور شناخت کی نئی تشکیل	17
4	باب سوم:۔ عدم تحفظ کی تاریخ: سیاست، مذہب اور معیشت کے بیچ مسلمان	23
5	باب چہارم:۔ قانون، ریاست اور مشروط شہریت	30
6	باب پنجم:۔ سماجی زندگی کی ٹوٹ پھوٹ: تعلیم، رہائش اور باہمی تعلقات	36
7	باب ششم:۔ بیانیہ، میڈیا اور خوف کی صنعت	42
8	باب ہفتم:۔ شناخت کی سیاست: تاریخ، مذہب اور معنی کی جنگ	48
9	باب ہشتم:۔ نوجوان نسل: امید، خوف اور خاموش مزاحمت	54
10	باب نہم:۔ معیشت، روزگار، غربت، سماجی زوال اور مسلمانوں کی اقتصادی غیر محفوظیت	60
11	باب دہم:۔ تعلیم اور علمی ترقی کی راہ میں رکاوٹیں	66
12	باب یازدہم:۔ مستقبل کے بھارت میں مسلمانوں کی ممکنہ راہیں اور امیدیں	71
13	باب دوازدہم:۔ بھارت میں مسلمانوں کی تاریخی غیر محفوظیت سے مستقبل کی راہوں تک	76
14	فہرستِ ماخذ کتاب۔	83

مقدمہ

یہ کتاب کسی لمحاتی ردِعمل کا نتیجہ نہیں، نہ کسی سیاسی موسم کی پیداوار ہے، اور نہ ہی کسی مخصوص واقعے کے فوری اثر میں لکھی گئی تحریر۔ یہ ایک طویل مشاہدے، مسلسل فکری اضطراب اور تاریخ کے خاموش مطالعے سے جنم لینے والی دستاویز ہے۔اس کے صفحات میں جو سوالات اٹھائے گئے ہیں، وہ آج کے نہیں، بلکہ کئی دہائیوں سے فضا میں معلق ہیں۔فرق صرف یہ ہے کہ اب وہ سوال نظر انداز نہیں کیے جاسکتے۔

برصغیر کی تاریخ محض سلطنتوں کے عروج و زوال کی کہانی نہیں، بلکہ شناخت، اختیار اور قبولیت کی ایک مسلسل کشمکش ہے۔آزادی کے بعد بھارت نے خود کو ایک ایسی ریاست کے طور پر پیش کیا جو مذہب، نسل اور زبان سے بالاتر ہو کر شہریوں کو مساوی حیثیت دیتی ہے۔ یہ دعویٰ اپنی جگہ ایک تاریخی پیش رفت تھا، اور اس نے کروڑوں انسانوں کو امید دی کہ شاید اس خطے میں پہلی بار ریاست طاقت کے بجائے اصول پر کھڑی ہوگی۔مگر تاریخ صرف نیت سے نہیں چلتی، وہ سماج کی نفسیات، سیاسی ترجیحات اور طاقت کے مراکز کے باہمی تعلق سے تشکیل پاتی ہے۔

یہ کتاب اسی نکتے سے آغاز کرتی ہے: وعدہ اور عمل کے درمیان بڑھتا ہوا فاصلہ۔

بھارت میں مسلمان محض ایک مذہبی اقلیت نہیں، بلکہ وہ ایک تاریخی حقیقت ہیں۔ وہ اس سرزمین کے مہمان نہیں، بلکہ اس کے معماروں میں شامل رہے ہیں۔ ان کی موجودگی کسی حادثے کا نتیجہ نہیں، بلکہ صدیوں کی تہذیبی تشکیل کا حصہ ہے۔ اس کے باوجود، آزادی کے بعد ان کی حیثیت ایک ایسے شہری کی بن گئی جسے بار بار اپنا وجود ثابت کرنا پڑا۔ یہ تضاد اسی وقت پیدا ہو گیا تھا جب قومیت کی تعریف کو اکثریت کی ثقافت سے جوڑنے کی خاموش کوشش شروع ہوئی۔

ابتدائی برسوں میں یہ کوشش مدھم تھی۔ ریاستی سطح پر سیکولرزم کو ایک اصول کے طور پر اپنایا گیا، اور آئین میں مذہبی آزادی، مساوات اور انصاف کی ضمانت دی گئی۔ مگر سماج کی گہرائیوں میں ایک بے نام سا سوال زندہ رہا: کیا یہ ملک واقعی سب کا ہے، یا کسی ایک شناخت کا مرکز؟ یہی سوال آگے چل کر سیاست کا ایندھن بنا۔

یہ کتاب کسی ایک حکومت، ایک جماعت یا ایک لیڈر کے خلاف فردِ جرم نہیں۔ یہ اس پورے فکری عمل کا مطالعہ ہے جس کے نتیجے میں ایک مخصوص بیانیہ غالب آتا چلا گیا۔ ہندوتوا محض ایک نظریہ نہیں، بلکہ ایک ذہنی ساخت ہے، جو قوم کو مذہب میں، تاریخ کو انتخاب میں، اور اختلاف کو غداری میں بدل دیتی ہے۔

یہ عمل اچانک نہیں ہوا، بلکہ منظّم، تدریجی اور صبر آزما تھا۔ تعلیمی اداروں، ثقافتی تنظیموں اور سماجی رسمیات کے ذریعے اس سوچ کو معمول بنایا گیا، یہاں تک کہ وہ غیر معمولی نہ رہی۔

مسلمان اس تبدیلی کے مرکز میں تھے، مگر فیصلہ ساز نہیں۔ وہ موضوع بن گئے، فریق نہیں رہے۔ ان پر بحث ہونے لگی، ان سے بات کم ہوتی چلی گئی۔ ان کی وفاداری، ان کی عبادت، ان کا لباس، حتیٰ کہ ان کی خاموشی بھی قابلِ اعتراض قرار پائی۔ یہ وہ مرحلہ تھا جہاں شہری ہونا ایک فطری حق کے بجائے ایک مشروط حیثیت بن گیا۔

یہ کتاب اسی مشروط حیثیت کا تجزیہ کرتی ہے۔

بابری مسجد کا انہدام محض ایک مذہبی تنازعہ نہیں تھا، بلکہ ریاستی غیر جانب داری کے تصور پر کاری ضرب تھی۔ اس واقعے نے یہ واضح کر دیا کہ جب اکثریتی جذبات منظّم ہو جائیں، تو قانون کمزور پڑ سکتا ہے۔ اس کے بعد ہونے والے فسادات، تحقیقات، اور سیاسی بیانات نے اس زخم کو بھرنے کے بجائے گہرا کیا۔ گجرات کے واقعات نے اس حقیقت کو مزید بے نقاب کر دیا کہ ریاستی مشینری کا جھکاؤ کس سمت ہو سکتا ہے، اور انصاف کس قدر تاخیر کا شکار ہو سکتا ہے۔

نریندر مودی کا سیاسی عروج اسی پس منظر میں ہوا۔ یہ عروج کسی فرد کی محض انتظامی صلاحیت کا نتیجہ نہیں تھا، بلکہ ایک ایسے بیانیے کی کامیابی تھی جو ترقی،

قوم پرستی اور اکثریتی فخر کو ایک ہی سانچے میں ڈھال دیتا ہے۔ اس بیانیے میں مسلمان نہ مرکزی کردار تھے، نہ ہی مکمل طور پر غائب۔ وہ ایک ایسے سایے کی صورت موجود تھے جس کے بغیر خوف کا تاثر مکمل نہیں ہو سکتا تھا۔

اس کتاب کا مقصد یہ ثابت کرنا نہیں کہ بھارت میں ہر ہندو مسلمان دشمن ہے، یا ہر ادارہ جانبدار۔ ایسا کہنا حقیقت کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ بلکہ مقصد یہ دکھانا ہے کہ جب ریاستی بیانیہ کسی ایک شناخت کے گرد گھومنے لگے، تو انفرادی نیتیں بے معنی ہو جاتی ہیں۔ مسئلہ افراد کا نہیں، ساخت کا ہوتا ہے۔

قانون سازی کا مرحلہ اسی ساخت کا منطقی تسلسل تھا۔ شہریت جیسے بنیادی تصور کو دستاویزات، فہرستوں اور جانچ کے عمل سے مشروط کیا گیا۔ این آر سی اور سی اے اے محض قوانین نہیں، بلکہ یہ اس سوچ کا اظہار ہیں جس میں کچھ شہری پیدائشی طور پر مشکوک سمجھے جاتے ہیں۔ اس عمل نے خوف کو ایک روزمرہ حقیقت بنا دیا، خاص طور پر ان لوگوں کے لیے جن کے پاس کاغذات سے زیادہ تاریخ تھی۔

یہ کتاب اس خوف کی نفسیات کو بھی سمجھنے کی کوشش کرتی ہے۔ خوف صرف جان کا نہیں ہوتا، وہ شناخت کا بھی ہوتا ہے۔ جب انسان کو یہ احساس ہو کہ وہ جو ہے، وہی اس کے خلاف استعمال ہو سکتا ہے، تو وہ آہستہ آہستہ خود کو محدود کرنے لگتا ہے۔ یہی محدودیت تعلیمی، معاشی اور سماجی پسماندگی میں بدل جاتی ہے۔

یہ پسماندگی کسی قدرتی کمزوری کا نتیجہ نہیں، بلکہ ایک منظّم عمل کا انجام ہوتی ہے۔

میڈیا نے اس عمل میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ خبر اور رائے کے درمیان فرق مٹتا چلا گیا۔ ٹیلی ویژن مباحثے مکالمہ نہیں رہے، بلکہ عدالت بن گئے جہاں فیصلے پہلے سے طے ہوتے تھے۔ ڈیجیٹل پلیٹ فارمز پر نفرت کو زبان، دلیل اور جواز مل گیا۔ اس ماحول میں سچ بولنا بہادری نہیں، خطرہ بن گیا۔

اس سب کے باوجود، یہ کتاب ناامیدی کی دستاویز نہیں۔ تاریخ ہمیشہ یک رخا نہیں ہوتی۔ اسی سماج میں وہ آوازیں بھی موجود رہیں جو سوال اٹھاتی رہیں، جو آئین کی طرف لوٹنے کی بات کرتی رہیں، جو انسان کو شناخت سے پہلے انسان سمجھنے پر زور دیتی رہیں۔ یہ آوازیں کبھی مضبوط ہوئیں، کبھی دب گئیں، مگر مکمل طور پر خاموش نہیں ہوئیں۔

یہ کتاب ان آوازوں کی نمائندگی کا دعویٰ نہیں کرتی، مگر ان کی موجودگی کو تسلیم کرتی ہے۔ یہ مانتی ہے کہ مستقبل کا بھارت ابھی طے نہیں ہوا۔ یہ ایک سوال ہے، ایک امکان ہے، ایک امتحان ہے۔ سیکولرزم محض آئینی اصطلاح نہیں، بلکہ ایک مسلسل عمل ہے، جسے روزمرہ زندگی میں زندہ رکھنا پڑتا ہے۔ اگر وہ عمل رک جائے، تو لفظ اپنی معنویت کھو دیتا ہے۔

مسلمانوں کا مسئلہ دراصل بھارت کے جمہوری وجود کا مسئلہ ہے۔ کیونکہ جمہوریت کی اصل آزمائش اکثریت کے آرام میں نہیں، بلکہ اقلیت کے

تحفظ میں ہوتی ہے۔ اگر کوئی ریاست اپنے کمزور شہری کو تحفظ نہیں دے سکتی، تو اس کی طاقت محض عددی رہ جاتی ہے، اخلاقی نہیں۔

یہ کتاب کسی فیصلے پر نہیں پہنچتی، بلکہ قاری کو فیصلے کے دائرے میں لے آتی ہے۔ یہ الزام نہیں لگاتی، بلکہ سوال اٹھاتی ہے۔ یہ ماضی کو رومانویت سے نہیں دیکھتی، اور نہ ہی حال کو مکمل اندھیرے میں ڈھالتی ہے۔ یہ تاریخ کو اس کی پوری پیچیدگی کے ساتھ سمجھنے کی کوشش ہے۔

اگر اس کتاب کے بعد قاری کچھ دیر کے لیے بھی رک کر یہ سوچے کہ قوم، ریاست اور شہری کے درمیان تعلق کیا ہونا چاہیے، تو یہ تحریر اپنا مقصد پورا کر چکی ہوگی۔ کیونکہ سوال زندہ رہے تو امید بھی زندہ رہتی ہے، اور امید کے بغیر کوئی معاشرہ آگے نہیں بڑھ سکتا۔

یہ کتاب اسی امید کے کمزور مگر ضدی چراغ کے ساتھ قاری کے ہاتھ میں دی جا رہی ہے۔

مصنف۔ یوسف خان آباخیل سدوزئی

باب اوّل:

آزادی، شناخت اور

ریاست کا پہلا امتحان

آزادی محض سیاسی واقعہ نہیں ہوتی، وہ ایک نفسیاتی اور اخلاقی لمحہ بھی ہوتی ہے۔ جب کوئی قوم آزادی حاصل کرتی ہے تو اس کے سامنے سب سے پہلا سوال یہ نہیں ہوتا کہ وہ کیا بنے گی، بلکہ یہ ہوتا ہے کہ وہ کس کو اپنے اندر شامل کرے گی۔ بھارت کی آزادی بھی اسی سوال کے ساتھ سامنے آئی۔ 1947ء میں برطانوی راج کا خاتمہ ہوا، مگر اس کے ساتھ ہی یہ سوال بھی جنم لے چکا تھا کہ یہ نئی ریاست کن بنیادوں پر اپنی شناخت قائم کرے گی۔

تقسیم ہند نے اس سوال کو اور بھی پیچیدہ بنا دیا۔ برصغیر دو ریاستوں میں تقسیم ہوا، مگر تاریخ، تہذیب اور آبادی کو مکمل طور پر تقسیم نہیں کیا جا سکا۔ بھارت میں رہ جانے والے مسلمان ایک ایسے لمحے میں داخل ہوئے جہاں ان کی موجودگی ایک سیاسی سوال بن چکی تھی، حالانکہ وہ صدیوں سے اسی سرزمین کا حصہ تھے۔ ان کے لیے آزادی کا مطلب نیا آغاز ضرور تھا، مگر بے فکری نہیں۔

آئین ساز اسمبلی کے مباحث اس اضطراب کی واضح جھلک دکھاتے ہیں۔ ایک طرف جواہر لعل نہرو، امبیڈکر اور ان جیسے رہنما تھے جو ریاست کو مذہب سے الگ رکھنے پر زور دے رہے تھے، اور دوسری طرف وہ آوازیں بھی

موجود تھیں جو قومیت کو اکثریتی ثقافت سے جوڑنے کی خواہش رکھتی تھیں۔ سیکولرزم کو آخرکار آئین کا حصہ بنایا گیا، مگر یہ فیصلہ مکمل اتفاقِ رائے کا نتیجہ نہیں تھا، بلکہ ایک فکری سمجھوتہ تھا۔

یہ سمجھوتہ ابتدا میں مضبوط دکھائی دیتا تھا۔ مسلمان شہری کے طور پر تسلیم کیے گئے، ان کے مذہبی حقوق کو آئینی تحفظ ملا، اور بظاہر ایسا محسوس ہوا کہ تقسیم کے زخم وقت کے ساتھ بھر جائیں گے۔ مگر سماج کی گہرائیوں میں ایک غیر مرئی فاصلہ قائم ہو چکا تھا۔ مسلمان اب محض شہری نہیں رہے تھے، وہ تقسیم کی یاد دہانی بھی بن گئے تھے۔

یہی وہ نفسیاتی بوجھ تھا جو آزادی کے فوراً بعد مسلمانوں کے ساتھ جڑ گیا۔ ان سے کہا نہیں گیا، مگر محسوس کرایا گیا کہ وہ ایک ایسے فیصلے کے وارث ہیں جس کا انہوں نے اجتماعی طور پر انتخاب نہیں کیا تھا۔ وفاداری ایک خاموش سوال بن گئی، اور خاموش سوال سب سے زیادہ دیرپا ہوتے ہیں۔

ابتدائی دہائیوں میں کانگریس کی سیاست نے اس سوال کو دبا کر رکھنے کی کوشش کی۔ قومی یکجہتی، ترقی اور سوشلسٹ منصوبہ بندی کے نعروں نے وقتی طور پر شناخت کے مسئلے کو پس منظر میں رکھا۔ مگر یہ پس منظر مستقل نہیں تھا۔ جیسے جیسے سیاسی مقابلہ بڑھا، ویسے ویسے شناخت دوبارہ مرکز میں آنے لگی۔

ہندو قوم پرستی کی فکری بنیادیں آزادی کے بعد نہیں رکھی گئیں، وہ اس

سے بہت پہلے موجود تھیں۔ فرق صرف یہ تھا کہ اب انہیں ایک نئے سیاسی ماحول میں کام کرنے کا موقع ملا۔ آر ایس ایس اور اس سے منسلک تنظیمیں خاموشی سے سماج میں اپنی جڑیں مضبوط کرتی رہیں۔ یہ کام انتخابی سیاست سے زیادہ ثقافتی اور تربیتی سطح پر کیا گیا، جہاں فوری نتائج نہیں مگر طویل اثرات ہوتے ہیں۔

مسلمان اس عمل سے تقریباً بے خبر رہے، یا شاید بے پروا۔ انہیں یقین تھا کہ آئین ان کا محافظ ہے، اور جمہوریت ان کے حقوق کی ضمانت۔ مگر آئین اور جمہوریت دونوں انسانی رویوں پر انحصار کرتے ہیں، اور جب رویے بدلنے لگیں تو تحریری ضمانتیں کمزور پڑ جاتی ہیں۔

1950ء اور 1960ء کی دہائیوں میں مسلمانوں کی سیاسی نمائندگی بتدریج کمزور ہوتی چلی گئی۔ وہ ووٹر تو تھے، مگر فیصلہ ساز نہیں رہے۔ ان کی قیادت یا تو علامتی تھی یا دفاعی۔ قومی سیاست میں مسلمان اکثر ایک مسئلہ کے طور پر دیکھے گئے، ایک شراکت دار کے طور پر نہیں۔

یہی وہ مرحلہ تھا جہاں معاشی اور تعلیمی تفاوت نے جنم لینا شروع کیا۔ ریاستی وسائل تک رسائی، روزگار کے مواقع، اور سماجی اعتماد — یہ سب چیزیں غیر محسوس طریقے سے محدود ہوتی گئیں۔ یہ عمل کسی ایک حکم نامے کا نتیجہ نہیں تھا، بلکہ ایک اجتماعی بے اعتنائی کی صورت اختیار کر گیا۔

1967ء کے بعد کانگریس کی گرفت کمزور ہونے لگی، اور سیاست

زیادہ مقابلہ جاتی ہوتی گئی۔ یہی وہ خلا تھا جس میں شناختی سیاست نے زور پکڑا۔ مذہب، زبان اور ثقافت کو ووٹ بینک میں تبدیل کرنے کا عمل تیز ہوا۔ مسلمان اس سیاست میں یا تو خوف کے سہارے جوڑے گئے یا الزام کے ذریعے الگ کیے گئے۔

1970ء اور 1980ء کی دہائیوں میں یہ رجحان مزید واضح ہو گیا۔ ایمرجنسی نے جمہوریت کی کمزوری کو بے نقاب کیا، اور اس کے بعد آنے والی سیاست نے عوامی جذبات کو ایک نئے رخ پر ڈال دیا۔ ہندو قوم پرستی اب محض حاشیے پر موجود نظریہ نہیں رہی، بلکہ سیاسی متبادل کے طور پر ابھرنے لگی۔

بابری مسجد کا تنازعہ اسی عمل کا نقط؟ عروج تھا، مگر اس سے پہلے ہی فضا تیار ہو چکی تھی۔ تاریخ کو مذہبی شناخت کے ساتھ جوڑنے کا کام مکمل ہو چکا تھا، اور مسلمان ایک بار پھر ماضی کے کردار میں قید کیے جا رہے تھے۔ وہ حال کے شہری کم اور تاریخ کے کردار زیادہ بن گئے تھے۔

یہ باب اسی لیے اہم ہے کہ یہ دکھاتا ہے کہ موجودہ حالات کسی اچانک حادثے کا نتیجہ نہیں۔ یہ ایک طویل فکری، سماجی اور سیاسی سفر کا حاصل ہیں۔ مسلمان آج جن سوالات کا سامنا کر رہے ہیں، وہ آزادی کے دن ہی پیدا ہو چکے تھے، مگر انہیں وقت کے ساتھ شکل ملی۔

ریاست کا پہلا امتحان یہی تھا کہ وہ اپنے سب سے کمزور شہری کے

ساتھ کیا رویہ اختیار کرتی ہے۔ بھارت نے اس امتحان میں کچھ جوابات ضرور دیے، مگر مکمل کامیابی حاصل نہ کر سکا۔ یہ ناکامی فوری نظر نہیں آئی، مگر اس کے اثرات گہرے اور دیرپا ثابت ہوئے۔

یہ باب کسی انجام پر نہیں پہنچتا، کیونکہ کہانی یہاں ختم نہیں ہوتی۔ یہ صرف بنیاد رکھتا ہے، وہ بنیاد جس پر بعد کے تمام ابواب کھڑے ہوں گے۔ کیونکہ جب تک آزادی کے بعد کے پہلے سوالات کو سمجھے بغیر آگے بڑھا جائے، موجودہ بحران محض شور بن کر رہ جاتا ہے، معنی نہیں بنتا۔

یہ باب اسی معنی کی تلاش کا پہلا قدم ہے۔

باب دوم:

اکثریت، قومیت اور شناخت کی نئی تشکیل

ریاستیں صرف آئین سے نہیں بنتیں، وہ بیانیے سے بھی تشکیل پاتی ہیں۔ آئین اصول فراہم کرتا ہے، مگر بیانیہ یہ طے کرتا ہے کہ ان اصولوں کو کس نظر سے دیکھا جائے گا۔ بھارت میں آزادی کے بعد کچھ عرصے تک آئین کا بیانیہ غالب رہا، مگر آہستہ آہستہ ایک متوازی تصورِ قومیت نے جنم لینا شروع کیا، جو خود کو تحریری قانون سے زیادہ تہذیبی سچائی سمجھتا تھا۔

یہ تصور یہ نہیں پوچھتا تھا کہ ریاست کیا کہتی ہے، بلکہ یہ کہ سماج خود کو کیسے دیکھتا ہے۔ یہاں سے قومیت کا مفہوم بدلنا شروع ہوا۔ شہری ہونا محض قانونی حیثیت نہ رہا، بلکہ ثقافتی قربت کا نام بنتا چلا گیا۔ جو اس قربت میں شامل تھا، وہ فطری شہری سمجھا گیا، اور جو ذرا فاصلے پر تھا، وہ مشکوک۔

اکثریت کا مسئلہ ہمیشہ تعداد کا نہیں ہوتا، بلکہ اعتماد کا ہوتا ہے۔ جب اکثریت خود کو خطرے میں محسوس کرنے لگے، تو وہ اپنی طاقت کو دفاعی زبان میں بیان کرنے لگتی ہے۔ بھارت میں یہی عمل ہوا۔ آزادی کے بعد ہندو اکثریت کو حقیقی معنوں میں کوئی وجودی خطرہ لاحق نہیں تھا، مگر تاریخ، تقسیم اور سیاست نے مل کر ایک نفسیاتی بے چینی کو زندہ رکھا۔

یہ بے چینی اچانک پیدا نہیں ہوئی۔ اس کی جڑیں نوآبادیاتی دور کے مباحث میں تھیں، جہاں مذہب کو شناخت کے بنیادی ستون کے طور پر استعمال کیا گیا۔ مردم شماری، جداگانہ نمائندگی اور سیاسی تقسیم نے مذہبی شناخت کو مضبوط کیا، اور آزادی کے بعد یہ شناخت تحلیل ہونے کے بجائے ایک نئے سیاسی سانچے میں ڈھل گئی۔

ہندوتوا اسی سانچے کا نام ہے۔ یہ محض مذہبی بالادستی کا تصور نہیں، بلکہ ایک مکمل تاریخی بیانیہ ہے، جس میں قوم، مذہب اور ثقافت کو ایک ہی خط میں لکھ دیا جاتا ہے۔ اس بیانیے میں بھارت ایک قدیم، مسلسل اور یک رنگ تہذیب کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، جس میں تنوع ایک وقتی انحراف بن جاتا ہے۔

مسلمان اس بیانیے میں اجنبی اس لیے نہیں ٹھہرتے کہ وہ باہر سے آئے، بلکہ اس لیے کہ وہ اس تسلسل کی کہانی میں فٹ نہیں بیٹھتے۔ ان کی موجودگی سوال بن جاتی ہے، اور سوال ہمیشہ عدم تحفظ کو جنم دیتا ہے۔ یہاں سے مسلمان ایک سماجی حقیقت کے بجائے ایک فکری مسئلہ بن جاتے ہیں۔

یہی وہ مرحلہ ہے جہاں قومیت کا تصور اخلاقی کے بجائے جذباتی ہو جاتا ہے۔ تاریخ انتخابی بن جاتی ہے، کچھ ادوار فخر کا نشان بنتے ہیں اور کچھ کو شرمندگی یا جبر کی علامت قرار دیا جاتا ہے۔ مسلم عہد کو اکثر اسی دوسرے خانے میں رکھا گیا، بغیر اس پیچیدگی کو سمجھے کہ تاریخ کبھی یک رخی نہیں ہوتی۔

تعلیمی نصاب، عوامی تقاریر اور ثقافتی علامتوں میں یہ بیانیہ آہستہ آہستہ رچ بس گیا۔ یہ عمل خاموش تھا، مگر مسلسل۔ نئی نسل کے لیے قومیت کا مطلب آئینی اقدار نہیں، بلکہ ایک مخصوص تاریخی فخر بننے لگا۔ یہاں ریاست پیچھے رہ گئی، اور سماج آگے بڑھ گیا۔

اس تبدیلی کا ایک اہم پہلو یہ تھا کہ اکثریت نے خود کو غیر جانبدار سمجھنا چھوڑ دیا۔ وہ خود کو قوم کا مترادف سمجھنے لگی۔ اس کے نتیجے میں اقلیتیں فطری طور پر حاشیے پر چلی گئیں۔ انہیں شامل کرنے کی کوشش کم، اور برداشت کرنے کا رویہ زیادہ غالب آ گیا۔

برداشت اور قبولیت میں یہی فرق ہے۔ قبولیت میں برابری ہوتی ہے، برداشت میں برتری کا احساس۔ مسلمان اکثر برداشت کیے جانے لگے، قبول کم ہوتے گئے۔ یہ فرق قانون میں شاید واضح نہ ہو، مگر سماجی رویوں میں پوری شدت کے ساتھ موجود تھا۔

اسی دوران سیاست نے اس بیانیے کو زبان دی۔ انتخابی کامیابیوں نے یہ ثابت کیا کہ شناخت کا سوال ووٹ میں تبدیل ہو سکتا ہے۔ جو بات پہلے ثقافتی سطح پر کہی جاتی تھی، اب سیاسی وعدوں میں شامل ہونے لگی۔ اکثریتی جذبات کو منظّم کرنا ایک مؤثر حکمتِ عملی بن گئی۔

یہاں ایک اہم تبدیلی رونما ہوئی۔ مسلمان اب صرف اقلیت نہیں

رہے، وہ اکثریت کی خود شناسی کا ذریعہ بن گئے۔ ان کے وجود کے ذریعے اکثریت اپنی تعریف کرنے لگی۔ ہم کون ہیں؟ اس سوال کا جواب اکثر یہ بن گیا کہ ہم وہ نہیں ہیں جو وہ ہیں۔

یہ منفی تعریف قومیت کے لیے خطرناک ہوتی ہے، کیونکہ یہ شناخت کو کسی مثبت قدر کے بجائے کسی دوسرے کی نفی پر قائم کرتی ہے۔ اس عمل میں مکالمہ ممکن نہیں رہتا، صرف تقابل باقی رہتا ہے۔ اور تقابل ہمیشہ طاقت کے عدم توازن کو جنم دیتا ہے۔

ریاست اس مرحلے پر یا تو توازن قائم رکھتی ہے، یا خاموشی اختیار کر لیتی ہے۔ بھارت میں طویل عرصے تک ریاست نے درمیانی راستہ اپنانے کی کوشش کی، مگر اس کوشش میں واضح مؤقف کی کمی رہی۔ یہی کمی بعد میں ایک خلا میں بدل گئی، جسے طاقتور بیانیے نے بھر دیا۔

مسلمانوں کے لیے یہ دور سب سے زیادہ پیچیدہ ثابت ہوا۔ وہ نہ کھل کر مزاحمت کر سکتے تھے، نہ مکمل طور پر مطابقت اختیار کر سکتے تھے۔ ان کی شناخت ایک بوجھ بن گئی، جسے سنبھالنا بھی ضروری تھا اور چھپانا بھی۔

یہ باب اسی داخلی اور خارجی کشمکش کو سمجھنے کی کوشش ہے۔ یہ دکھاتا ہے کہ اکثریت اور قومیت کے درمیان تعلق کیسے بدلتا ہے، اور اس تبدیلی کا اثر اقلیت پر کیسے پڑتا ہے۔ یہ کسی ایک لمحے کی کہانی نہیں، بلکہ ایک ذہنی ارتقا کی روداد ہے۔

یہ ارتقا ہمیں یہاں تک لے آیا کہ قومیت ایک سوال نہیں رہی، بلکہ دعویٰ بن گئی۔ اور جب قومیت دعویٰ بن جائے، تو اختلاف خود بخود جرم بننے لگتا ہے۔

یہ باب اسی جرم کی ابتدا کو سمجھنے کی کوشش ہے، تا کہ آگے کے ابواب میں اس کے نتائج کو زیادہ وضاحت کے ساتھ دیکھا جا سکے۔ کیونکہ جب تک ذہن کی تشکیل کو نہ سمجھا جائے، عمل کی شدت محض ایک واقعہ معلوم ہوتی ہے، تاریخ نہیں۔

باب سوم:

عدمِ تحفظ کی تاریخ:

سیاست، مذہب اور

معیشت کے بیچ مسلمان

ریاست میں عدمِ تحفظ کبھی ایک دن میں پیدا نہیں ہوتا۔ یہ ایک تدریجی عمل ہوتا ہے، جس میں خوف پہلے امکان بنتا ہے، پھر معمول، اور آخرکار حقیقت۔ بھارت میں مسلمانوں کا عدمِ تحفظ بھی کسی ایک قانون، ایک فساد یا ایک حکومت کا نتیجہ نہیں، بلکہ ایک طویل تاریخی تسلسل کا حاصل ہے، جس میں سیاست، مذہب اور معیشت ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔

آزادی کے فوراً بعد یہ سمجھا جا رہا تھا کہ تقسیم کے زخم بھرنے میں وقت لگے گا، مگر بالآخر جمہوری ادارے سب کو تحفظ فراہم کر دیں گے۔ مگر عملی صورت حال اس امید سے مختلف نکلی۔ 1947ء کے فسادات نے یہ واضح کر دیا تھا کہ مسلمان صرف جسمانی طور پر ہی نہیں، نفسیاتی طور پر بھی غیر محفوظ ہو چکے ہیں۔ قتل وغارت کے بعد جو خاموشی آئی، وہ امن کی نہیں، خوف کی تھی۔

یہ خوف آئین کی موجودگی کے باوجود ختم نہ ہو سکا۔ اگرچہ ریاست نے باضابطہ طور پر مساوات کی ضمانت دی، مگر سماجی سطح پر مسلمان کو شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا رہا۔ وفاداری، حب الوطنی اور نیت جیسے سوالات ان کے ساتھ مستقل طور پر جڑ گئے۔ یہ سوالات کسی اور شہری کے لیے اتنے بنیادی نہیں تھے۔

1950ء اور 1960ء کی دہائیوں میں فسادات کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہوا جو مختلف ریاستوں میں بار بار دہرایا گیا۔ ان فسادات کی نوعیت صرف مذہبی نہیں تھی، بلکہ ان کے پیچھے سیاسی محرکات، مقامی طاقت کی کشمکش اور ریاستی مشینری کی ناکامی واضح طور پر دیکھی جا سکتی ہے۔ اکثر مواقع پر پولیس کی غیر فعالیت، انتظامیہ کی تاخیر اور انصاف کے عمل کی سستی نے مسلمانوں کے عدمِ تحفظ کو مزید گہرا کیا۔

سیاسی سطح پر مسلمان ایک ایسی اقلیت میں بدلتے چلے گئے جو تعداد میں تو موجود تھی، مگر طاقت سے محروم۔ ان کی سیاسی شمولیت زیادہ تر ردِعمل پر مبنی رہی۔ وہ اپنے حقوق کا مطالبہ کرنے کے بجائے، اپنے وجود کے دفاع پر مجبور ہوتے گئے۔ یہ دفاعی سیاست کبھی مضبوط قیادت پیدا نہیں کر سکتی، کیونکہ اس کی بنیاد خوف پر ہوتی ہے، وژن پر نہیں۔

1970ء اور 1980ء کی دہائیوں میں یہ عدمِ تحفظ ایک نئے مرحلے میں داخل ہوا۔ فسادات اب محض مقامی نہیں رہے، بلکہ قومی سیاست کا حصہ بننے لگے۔ مذہبی شناخت کو منظّم طریقے سے سیاسی فائدے کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔ مسلمان ایک ایسے مخالف کے طور پر پیش کیے گئے جو بیک وقت کمزور بھی تھا اور خطرناک بھی۔ یہ تضاد سیاسی بیانیے میں اکثر استعمال ہوتا ہے، کیونکہ یہ خوف اور حقارت دونوں کو جنم دیتا ہے۔

بابری مسجد کا تنازعہ اس عدمِ تحفظ کا فیصلہ کن موڑ ثابت ہوا۔ برسوں تک جاری رہنے والی مہم، اشتعال انگیز تقاریر، اور آخرکار مسجد کا انہدام صرف ایک عبادت گاہ کا نقصان نہیں تھا۔ یہ اس بات کا اعلان تھا کہ مسلمان کی مذہبی علامتیں بھی محفوظ نہیں رہیں۔ اس واقعے کے بعد جو فسادات ہوئے، ان میں مسلمانوں کی جان، مال اور عزت کو جس پیمانے پر نقصان پہنچا، اس نے ریاستی تحفظ کے تصور کو شدید دھچکا پہنچایا۔

گجرات کے واقعات نے اس احساس کو مزید پختہ کر دیا۔ یہاں عدمِ تحفظ صرف ہجوم کی سطح پر نہیں تھا، بلکہ ریاستی سطح پر بھی محسوس کیا گیا۔ تحقیقات، عدالتی کارروائیاں اور انصاف کے مراحل نے یہ سوال پیدا کیا کہ اگر ریاستی ادارے ہی غیر جانبدار نہ رہیں تو اقلیت کہاں جائے؟ یہ سوال صرف گجرات تک محدود نہیں رہا، بلکہ پورے ملک میں مسلمانوں کے اجتماعی شعور کا حصہ بن گیا۔

مذہبی عدمِ تحفظ کے ساتھ ساتھ سیاسی عدمِ تحفظ بھی بڑھتا چلا گیا۔ مسلمانوں کی پارلیمانی نمائندگی کم ہوتی گئی، اور کابینہ، بیوروکریسی اور پالیسی سازی کے اداروں میں ان کی موجودگی علامتی سطح پر محدود ہو گئی۔ اس کمی نے یہ تاثر پیدا کیا کہ مسلمان ریاست کے فیصلوں میں شریک نہیں، بلکہ ان فیصلوں کے موضوع ہیں۔

یہی کیفیت قانون سازی کے مرحلے میں سب سے زیادہ نمایاں ہوئی۔

جب شہریت جیسے بنیادی حق کو مخصوص کاغذات اور معیار سے مشروط کیا گیا، تو سب سے زیادہ متاثر وہی طبقہ ہوا جس کی تاریخی، معاشی اور تعلیمی حالت پہلے ہی کمزور تھی۔ این آر سی اور اس سے جڑی ہوئی کارروائیوں نے یہ واضح کر دیا کہ مسلمان کے لیے شہری ہونا ایک مسلسل آزمائش بن چکا ہے۔

یہ عدمِ تحفظ صرف ریاستی سطح پر نہیں، بلکہ روزمرہ زندگی میں بھی محسوس کیا جانے لگا۔ عبادات، مذہبی رسومات اور حتیٰ کہ مذہبی شناخت کے ظاہری اظہار کو شک کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا۔ کہیں اذان پر اعتراض، کہیں لباس پر سوال، کہیں خوراک پر تشدد — یہ سب واقعات کسی ایک حادثے کی صورت میں نہیں، بلکہ ایک عمومی رجحان کے طور پر سامنے آئے۔

معاشی سطح پر یہ عدمِ تحفظ مزید گہرا ثابت ہوا۔ مسلمان پہلے ہی تعلیم اور روزگار کے میدان میں پیچھے تھے، مگر بڑھتے ہوئے سماجی تعصب نے ان کے لیے مواقع کو مزید محدود کر دیا۔ کرائے پر مکان ملنا مشکل ہوا، کاروبار میں اعتماد کم ہوا، اور روزگار میں امتیازی رویے عام ہوتے گئے۔ یہ سب کچھ کسی تحریری قانون کے تحت نہیں، بلکہ سماجی رویوں کے ذریعے ہوا، جسے ثابت کرنا مشکل مگر جھیلنا آسان ہوتا ہے۔

ریاستی کمیشنوں اور تحقیقی رپورٹوں نے وقتاً فوقتاً ان حقائق کی نشاندہی کی، مگر ان رپورٹوں کا انجام اکثر فائلوں کی حد تک محدود رہا۔ اعداد و شمار موجود

تھے، مگر سیاسی عزم ناپید تھا۔ یہ تضاد مسلمانوں کے عدمِ تحفظ کو مزید شدید کرتا گیا، کیونکہ جب مسئلہ تسلیم تو کیا جائے مگر حل نہ کیا جائے، تو ناامیدی بڑھتی ہے۔

میڈیا نے اس عدمِ تحفظ کو کم کرنے کے بجائے کئی مواقع پر بڑھایا۔ مسلمانوں کو اکثر منفی خبروں، جرائم یا تنازعات کے ساتھ جوڑا گیا۔ مثبت کردار، سماجی خدمات اور عام زندگی کی کہانیاں پس منظر میں چلی گئیں۔ اس نمائندگی نے عوامی رائے کو متاثر کیا، اور مسلمان کی شبیہ ایک مسئلہ زدہ طبقے کے طور پر مستحکم ہوتی چلی گئی۔

ڈیجیٹل دور میں یہ عدمِ تحفظ ایک نئی شکل میں ظاہر ہوا۔ نفرت انگیز مواد، دھمکیاں اور کردار کشی اب محدود حلقوں تک نہیں رہی، بلکہ عوامی پلیٹ فارمز پر عام ہوگئی۔ اس فضا میں مسلمان کے لیے خاموش رہنا بقا کی حکمتِ عملی بن گئی، اور بولنا خطرہ۔

یہ باب یہ ثابت کرنے کی کوشش نہیں کرتا کہ ہر ہندو مسلمان دشمن ہے، یا ہر ادارہ جانبدار۔ حقیقت اس سے زیادہ پیچیدہ ہے۔ مگر یہ ضرور واضح کرتا ہے کہ ایک مجموعی ماحول ایسا تشکیل پا چکا ہے جس میں مسلمان خود کو محفوظ محسوس نہیں کرتے۔ اور کسی بھی جمہوری ریاست میں احساسِ تحفظ اتنا ہی اہم ہوتا ہے جتنا قانونی تحفظ۔

عدمِ تحفظ کا سب سے خطرناک پہلو یہ ہے کہ وہ انسان کو مستقبل سے کاٹ دیتا ہے۔ جب کوئی طبقہ مستقل دفاعی حالت میں رہے، تو وہ ترقی، تخلیق

اور شراکت سے محروم ہو جاتا ہے۔ بھارت کے مسلمانوں کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ وہ آہستہ آہستہ ریاست کے شریک کے بجائے ریاست کے مسئلے کے طور پر دیکھے جانے لگے۔

یہ باب اسی تبدیلی کی داستان ہے۔ یہ دکھاتا ہے کہ کیسے سیاسی فیصلے، مذہبی بیانیے اور معاشی محرومیاں مل کر ایک ایسی فضا بناتے ہیں جس میں عدمِ تحفظ محض احساس نہیں، بلکہ ایک زندہ حقیقت بن جاتا ہے۔

یہ حقیقت سمجھنا اس لیے ضروری ہے کہ آگے کے ابواب میں ہم صرف یہ نہیں دیکھیں گے کہ کیا ہوا، بلکہ یہ بھی کہ اس کا نتیجہ کیا نکلا، اور اس سے نکلنے کے امکانات کہاں باقی ہیں۔ کیونکہ جب تک مسئلے کی گہرائی کو تسلیم نہ کیا جائے، حل محض نعرہ رہ جاتا ہے۔

یہ باب اسی تسلیم کا مطالبہ کرتا ہے— خاموش، سنجیدہ اور ناگزیر۔

باب چہارم:

قانون، ریاست اور مشروط شہریت

ریاست کا اصل امتحان جنگ میں نہیں، امن میں ہوتا ہے۔ طاقت کا استعمال ہر ریاست کر سکتی ہے، مگر انصاف کا تسلسل صرف وہی ریاست قائم رکھ سکتی ہے جو اپنے قانون کو طاقت سے الگ رکھے۔ بھارت نے آزادی کے بعد خود کو ایک ایسی جمہوری ریاست کے طور پر پیش کیا تھا جہاں قانون سب کے لیے یکساں ہوگا، اور شہری کی حیثیت کسی عقیدے، نسل یا ثقافت سے مشروط نہیں ہوگی۔ مگر وقت کے ساتھ یہ اصول اپنی معنوی مضبوطی کھوتا چلا گیا، اور قانون ایک ایسا میدان بننے لگا جہاں غیر جانبداری کا دعویٰ تو برقرار رہا، مگر اس کا اطلاق غیر مساوی ہوتا گیا۔

مسلمانوں کے لیے ریاست کے ساتھ تعلق ابتدا ہی سے پیچیدہ رہا۔ آئینی سطح پر وہ برابر کے شہری تھے، مگر انتظامی اور سماجی سطح پر ان کی شہریت اکثر سوال کے دائرے میں رہی۔ یہ سوال کسی ایک دفعہ یا قانون میں واضح نہیں تھا، بلکہ مختلف پالیسیوں، رویّوں اور فیصلوں میں بکھرا ہوا تھا۔ یہی بکھراؤ اسے زیادہ خطرناک بناتا ہے، کیونکہ غیر تحریری امتیاز کو چیلنج کرنا ہمیشہ مشکل ہوتا ہے۔

آزادی کے بعد کے ابتدائی عشروں میں قانون نے بظاہر مسلمانوں کو

تحفظ فراہم کیا، مگر جب بھی سماجی کشیدگی بڑھی، قانون پیچھے ہٹتا دکھائی دیا۔ فسادات کے دوران ریاستی مشینری کی غیر فعالیت، کرفیو کا غیر مساوی نفاذ، اور بعد ازاں انصاف کے عمل کی سست رفتاری نے یہ تاثر مضبوط کیا کہ قانون کمزور کے لیے اتنا مضبوط نہیں جتنا طاقتور کے لیے ہے۔ یہ تاثر محض جذباتی نہیں تھا، بلکہ بار بار دہرائے گئے تجربات کا نتیجہ تھا۔

عدالتیں جمہوریت کا آخری سہارا سمجھی جاتی ہیں، مگر یہاں بھی مسلمان اکثر انصاف کے انتظار میں تھک گئے۔ مقدمات برسوں چلتے رہے، گواہ مکر گئے، اور فیصلے ایسے آئے جنہوں نے قانون کی اخلاقی حیثیت پر سوال کھڑے کیے۔ انصاف اگر بہت دیر سے ملے تو وہ بھی عدمِ انصاف کی ایک صورت بن جاتا ہے، اور مسلمانوں نے اس تاخیر کو مسلسل محسوس کیا۔

ریاستی اداروں میں نمائندگی کا مسئلہ بھی اسی باب کا حصہ ہے۔ پولیس، عدلیہ، بیوروکریسی اور فیصلہ ساز اداروں میں مسلمانوں کی کمزور موجودگی محض ایک عددی مسئلہ نہیں، بلکہ اعتماد کا بحران ہے۔ جب کسی شہری کو یہ احساس ہو کہ ریاستی اداروں میں اس کی آواز نہ ہونے کے برابر ہے، تو وہ خود کو ریاست کا حصہ نہیں، بلکہ اس کے سامنے کھڑا محسوس کرنے لگتا ہے۔

یہ بحران سب سے واضح طور پر قانون سازی کے نئے دور میں سامنے آیا۔ جب شہریت جیسے بنیادی تصور کو ازسرِ نو متعین کرنے کی کوشش کی گئی، تو یہ

سوال ناگزیر ہو گیا کہ شہری ہونے کا معیار کیا ہے۔ کیا شہریت پیدائش، رہائش اور سماجی شمولیت سے بنتی ہے، یا کاغذات، فہرستوں اور سرکاری تصدیق سے؟ اس سوال کا جواب جس سمت میں دیا گیا، اس نے مسلمانوں کے عدمِ تحفظ کو قانونی شکل دے دی۔

شہریت کا تصور اگر مشروط ہو جائے تو سب سے زیادہ متاثر وہی ہوتے ہیں جو پہلے ہی حاشیے پر ہوں۔ مسلمان، جو تعلیمی اور معاشی طور پر نسبتاً کمزور تھے، اس نئے نظام میں سب سے زیادہ غیر محفوظ نظر آئے۔ کاغذات کی عدم موجودگی کو وفاداری کی کمی سے جوڑ دیا گیا، اور تاریخ کو ثبوت کے مقابل کھڑا کر دیا گیا۔ یہ وہ مقام تھا جہاں ریاست نے شہری سے یہ کہنے کے بجائے کہ "تم ہمارے ہو"، یہ پوچھنا شروع کر دیا کہ "تم ہو بھی یا نہیں؟"

یہ سوال محض انتظامی نہیں تھا، بلکہ گہرا نفسیاتی تھا۔ اس نے شہری اور ریاست کے درمیان اعتماد کو مجروح کیا۔ جب ریاست اپنے شہری پر شک کرنے لگے، تو شہری بھی ریاست سے فاصلہ اختیار کر لیتا ہے۔ یہی فاصلہ آگے چل کر سماجی علیحدگی، سیاسی لاتعلقی اور معاشی پسماندگی میں بدل جاتا ہے۔

قانون کا ایک اور پہلو وہ ہے جو براہِ راست مذہبی آزادی سے جڑا ہے۔ عبادت گاہوں، مذہبی رسوم اور عقیدے کے اظہار پر بڑھتی ہوئی قانونی اور انتظامی قدغنیں اس بات کی علامت ہیں کہ مذہبی آزادی اب غیر مشروط حق نہیں

رہی۔ کہیں اجازت ناموں کی شرط، کہیں شور کا مسئلہ، کہیں عوامی نظم کا بہانہ — یہ سب قانونی زبان میں کہے گئے وہ جملے ہیں جن کے اثرات ایک خاص طبقے پر زیادہ پڑتے ہیں۔

ریاست کا یہ دعویٰ کہ قانون سب کے لیے برابر ہے، اس وقت کمزور پڑ جاتا ہے جب اس کے اطلاق میں فرق نظر آئے۔ اگر ایک مذہبی اجتماع ثقافت بن جائے اور دوسرا خطرہ، اگر ایک نعرہ عقیدت ہو اور دوسرا اشتعال، تو قانون کی غیر جانب داری محض لفظ رہ جاتی ہے۔ مسلمانوں نے اس فرق کو بار بار محسوس کیا، اور یہی احساس ان کے عدمِ تحفظ کو ادارہ جاتی بنا گیا۔

یہ باب اس نکتے پر بھی روشنی ڈالتا ہے کہ قانون صرف وہ نہیں جو کتابوں میں لکھا ہو، بلکہ وہ بھی ہے جو نافذ کیا جائے۔ نافذ نہ ہونے والا قانون امید تو دے سکتا ہے، تحفظ نہیں۔ اور جب نافذ ہونے والا قانون کسی ایک سمت جھک جائے، تو وہ انصاف کے بجائے طاقت کی علامت بن جاتا ہے۔

ریاستی بیانیے میں بھی ایک واضح تبدیلی محسوس کی جا سکتی ہے۔ پہلے ریاست شہری کو یقین دلانے کی کوشش کرتی تھی، اب وہ اسے نظم و ضبط کا پابند بنانے پر زیادہ زور دیتی ہے۔ یہ تبدیلی محض زبان کی نہیں، رویّے کی ہے۔ شہری اب شراکت دار کم اور مشتبہ عنصر زیادہ سمجھا جانے لگا ہے، اور مسلمان اس تبدیلی کا سب سے پہلا ہدف بنے۔

اس تمام عمل کا نتیجہ یہ نکلا کہ شہریت ایک فطری تعلق کے بجائے ایک قانونی جنگ بن گئی۔ جو شہری ہونا چاہیے تھا، وہ درخواست گزار بن گیا۔ اور جو ریاست محافظ ہونی چاہیے تھی، وہ منصف بن گئی—ایسا منصف جس کے سوالات کے جواب ہر کسی کے پاس برابر نہیں ہوتے۔

یہ باب کسی ایک قانون یا فیصلے کو الگ کر کے نہیں دیکھتا، بلکہ اس مجموعی رجحان کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے جس میں ریاست، قانون اور شہریت کا تعلق بدلتا چلا گیا۔ یہ دکھاتا ہے کہ عدمِ تحفظ اب صرف سماجی یا سیاسی مسئلہ نہیں رہا، بلکہ ایک ادارہ جاتی حقیقت بن چکا ہے۔

یہاں سے کتاب ایک نئے مرحلے میں داخل ہوتی ہے۔ اگلے ابواب میں ہم دیکھیں گے کہ جب قانون اور ریاست کا رویہ بدلتا ہے تو سماج، تعلیم، میڈیا اور روزمرہ زندگی پر اس کے کیا اثرات پڑتے ہیں۔ کیونکہ ریاستی فیصلے صرف عدالتوں تک محدود نہیں رہتے، وہ گلیوں، اسکولوں اور ذہنوں میں اتر جاتے ہیں۔

یہ باب اسی دروازے پر کھڑا ہے—جہاں قانون کی زبان خاموش ہو جاتی ہے، اور اس کے اثرات بولنے لگتے ہیں۔

باب پنجم:

سماجی زندگی کی ٹوٹ پھوٹ:

تعلیم، رہائش اور باہمی تعلقات

ریاستی فیصلے اگرچہ پارلیمان اور عدالتوں میں ہوتے ہیں، مگر ان کے اثرات سب سے پہلے گلیوں، گھروں اور ذہنوں میں ظاہر ہوتے ہیں۔ قانون کی زبان رسمی ہوتی ہے، مگر اس کا سایہ غیر رسمی زندگی پر پڑتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں مسلمانوں کا عدمِ تحفظ محض سیاسی یا قانونی مسئلہ نہیں رہتا، بلکہ روزمرہ تجربہ بن جاتا ہے۔

جب ریاست کسی طبقے کو مشکوک نگاہ سے دیکھنے لگے تو سماج اس نگاہ کو سیکھ لیتا ہے۔ بھارت میں یہی ہوا۔ قانون نے سوال اٹھایا، سماج نے فاصلے بنا لیے۔ اور یہ فاصلے صرف نظریاتی نہیں تھے، بلکہ جغرافیائی، تعلیمی اور نفسیاتی بھی بن گئے۔

رہائش اس تبدیلی کی سب سے واضح مثال ہے۔ شہروں میں مسلمانوں کے لیے مکان کرائے پر لینا یا خریدنا بتدریج مشکل ہوتا چلا گیا۔ یہ مشکل کسی تحریری پابندی کی صورت میں نہیں تھی، بلکہ خاموش انکار کی شکل میں سامنے آئی۔ فون کال کا جواب نہ آنا، اچانک مکان کا بک ہو جانا، یا ''ہم نے پہلے ہی کسی اور کو دے دیا ہے'' جیسے جملے ایک مستقل تجربہ بن گئے۔ یوں مسلمان آہستہ آہستہ مخصوص محلوں تک محدود ہوتے گئے۔

یہ محلّے ابتدا میں شناخت کے تحفظ کی علامت تھے، مگر وقت کے ساتھ وہ علیحدگی کی علامت بن گئے۔ گھیٹوزیشن نے سماجی میل جول کو کم کیا، مواقع کو محدود کیا، اور بداعتمادی کو بڑھایا۔ جب ایک طبقہ مسلسل ایک ہی جگہ سمٹتا جائے تو اس کے مسائل بھی سمٹ کر اس کے ساتھ جڑ جاتے ہیں — تعلیم، صحت، روزگار، سب کچھ۔

تعلیم اس دائرے کی دوسری اہم کڑی ہے۔ اسکول وہ جگہ ہونی چاہیے جہاں بچے اپنی شناخت سے پہلے شہری بنتے ہیں، مگر مسلمانوں کے لیے اسکول بھی اکثر اجنبیت کا مقام بن گئے۔ نصابی مواد میں تاریخ کی یک رخی تعبیر، کلاس روم میں غیر محسوس امتیاز، اور ہم جماعتوں کے رویے — یہ سب مل کر ایک ایسا ماحول بناتے ہیں جہاں مسلم بچہ خود کو دفاعی حالت میں پاتا ہے۔

اساتذہ کی خاموشی، یا بعض اوقات جانبداری، اس احساس کو مزید گہرا کرتی ہے۔ جب کسی بچے کو یہ احساس ہو جائے کہ اس کی شناخت ایک بوجھ ہے، تو اس کی سیکھنے کی صلاحیت متاثر ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تعلیمی پسماندگی محض غربت کا نتیجہ نہیں، بلکہ عدمِ تحفظ کی پیداوار بھی ہے۔

اعلیٰ تعلیم میں یہ مسئلہ اور زیادہ نمایاں ہو جاتا ہے۔ یونیورسٹیاں، جو مکالمے اور تنوع کی علامت ہونی چاہئیں، اکثر شناختی تنازعات کا میدان بن جاتی ہیں۔ مسلمان طلبہ کو یا تو نمائندہ بنا دیا جاتا ہے، یا مشتبہ عنصر۔ ان کی سیاسی

سرگرمیوں کو شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، اور ان کی خاموشی کو لاتعلقی سمجھا جاتا ہے۔ دونوں صورتوں میں وہ غیر محفوظ ہی رہتے ہیں۔

یہی عدمِ تحفظ روزگار کے میدان میں بھی نظر آتا ہے۔ قابلیت کے باوجود ملازمت نہ ملنا، یا انٹرویو کے بعد خاموشی، ایک عام تجربہ بنتا چلا گیا۔ نام، پتہ اور لباس ایسے اشارے بن گئے جو فیصلہ کن ثابت ہوتے ہیں۔ یہ امتیاز تحریری نہیں ہوتا، مگر مسلسل ہوتا ہے، اور یہی تسلسل اسے خطرناک بناتا ہے۔

کاروبار میں بھی مسلمانوں کو اعتماد کے بحران کا سامنا رہا۔ چھوٹے تاجر، دستکار اور دکاندار اکثر سماجی بائیکاٹ یا غیر اعلانیہ دباؤ کا شکار ہوئے۔ فسادات کے بعد سب سے پہلے لوٹا جانے والا علاقہ اکثر وہی ہوتا ہے جہاں مسلمان آباد ہوں۔ اس لوٹ مار کا نقصان صرف مالی نہیں، بلکہ نفسیاتی بھی ہوتا ہے، کیونکہ یہ احساس جڑ پکڑ لیتا ہے کہ محنت کی کمائی کسی بھی لمحے ضائع ہوسکتی ہے۔

سماجی تعلقات کی سطح پر یہ فاصلہ اور بھی پیچیدہ شکل اختیار کرتا ہے۔ ہمسائیگی، دوستی اور مشترکہ تہوار — یہ سب چیزیں آہستہ آہستہ کمزور ہوتی گئیں۔ پہلے جو فرق مذہبی تھا، وہ اب سماجی شناخت میں بدل گیا۔ مسلمان اب صرف "دوسرے" نہیں رہے، بلکہ "خطرے" کے طور پر دیکھے جانے لگے۔ یہ تبدیلی اچانک نہیں آئی، بلکہ بیانیے، میڈیا اور سیاست کے امتزاج سے پیدا ہوئی۔

خوف نے باہمی تعلقات کو محتاط بنا دیا۔ مسلمان بولنے سے پہلے سوچنے

لگے، ہنسنے سے پہلے دیکھنے لگے، اور احتجاج سے پہلے ڈرنے لگے۔ یہ خودساختہ احتیاط دراصل بقا کی حکمتِ عملی تھی، مگر اس نے سماجی شرکت کو کمزور کر دیا۔ جو طبقہ خود کو محفوظ محسوس نہ کرے، وہ سماج میں فعال کردار ادا نہیں کر سکتا۔

خواتین کے لیے یہ عدمِ تحفظ دوہرا ثابت ہوا۔ ایک طرف وہ صنفی تعصب کا شکار رہیں، دوسری طرف مذہبی شناخت کے باعث سماجی دباؤ کا سامنا کیا۔ حجاب، لباس اور آزادی — یہ سب ذاتی انتخاب کے بجائے عوامی بحث کا موضوع بن گئے۔ مسلمان عورت کی ذات ایک علامت بنا دی گئی، اور علامتیں ہمیشہ تنازعے کا مرکز بنتی ہیں۔

یہ تمام عوامل مل کر ایک ایسی فضا بناتے ہیں جس میں مسلمان کی روزمرہ زندگی مستقل دباؤ میں رہتی ہے۔ یہ دباؤ کبھی براہِ راست تشدد کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، کبھی نرم امتیاز کی شکل میں۔ مگر دونوں صورتوں میں اس کا نتیجہ ایک ہی ہوتا ہے: احساسِ عدمِ تحفظ۔

اس احساس کا سب سے خطرناک پہلو یہ ہے کہ یہ نسل در نسل منتقل ہوتا ہے۔ بچے اپنے والدین کے خوف کو جذب کرتے ہیں، نوجوان اپنے مستقبل کو محدود سمجھنے لگتے ہیں، اور بزرگ ماضی کی حفاظت میں الجھ جاتے ہیں۔ یوں ایک پوری کمیونٹی حال میں جینے کے بجائے دفاع میں جیتی ہے۔

ریاست اس مقام پر اکثر غیر موجود محسوس ہوتی ہے۔ قانون اپنی جگہ

موجود ہے، مگر اس کا سایہ کمزور پڑ جاتا ہے۔ پولیس رپورٹ درج کرنے سے ہچکچاہٹ، عدالت جانے کا خوف، اور میڈیا سے بات کرنے کا خطرہ — یہ سب اس بات کی علامت ہیں کہ شہری اور ریاست کے درمیان فاصلہ بڑھ چکا ہے۔

یہ باب اسی فاصلے کی تفصیل ہے۔ یہ دکھاتا ہے کہ کیسے ریاستی و قانونی فضا سماجی زندگی میں دراڑیں ڈالتی ہے، اور یہ دراڑیں آہستہ آہستہ خلیج میں بدل جاتی ہیں۔ یہ خلیج صرف مسلمانوں اور ریاست کے درمیان نہیں، بلکہ مختلف شہریوں کے درمیان بھی پیدا ہوتی ہے۔

یہاں سے کتاب ایک اور مرحلے میں داخل ہوتی ہے۔ اگلے ابواب میں ہم دیکھیں گے کہ میڈیا، بیانیہ اور عوامی گفتگو اس سماجی عدمِ تحفظ کو کیسے تقویت دیتے ہیں، اور شناخت کس طرح ایک مستقل سیاسی ہتھیار بن جاتی ہے۔

باب پنجم اس لحاظ سے ایک پل ہے — ریاستی فیصلوں اور سماجی نتائج کے درمیان۔ یہ وہ مقام ہے جہاں قانون خاموش ہو جاتا ہے، اور زندگی بولنے لگتی ہے۔ اور زندگی کی یہ آوازیں نظر انداز کی جائیں تو تاریخ صرف کتابوں میں نہیں، گلیوں میں لکھی جاتی ہے۔

یہ باب اسی تحریر کو پڑھنے کی دعوت ہے۔

باب ششم:

بیانیہ، میڈیا اور خوف کی صنعت

ہر دور کی اپنی زبان ہوتی ہے، اور اس زبان کے ذریعے ہی طاقت خود کو قابلِ قبول بناتی ہے۔ جدید دور میں یہ زبان میڈیا بولتا ہے— صرف خبریں نہیں، بلکہ معنی، تاثر اور ترجیحات بھی۔ میڈیا اب محض واقعات کا آئینہ نہیں رہا، بلکہ ایک ایسا آلہ بن چکا ہے جو طے کرتا ہے کہ کیا دیکھا جائے، کیسے دیکھا جائے، اور کس زاویے سے سمجھا جائے۔ بھارت میں مسلمانوں کے عدمِ تحفظ کو سمجھنے کے لیے اس بیانیاتی طاقت کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں۔

میڈیا کا سب سے بڑا اثر یہ نہیں کہ وہ کیا کہتا ہے، بلکہ یہ ہے کہ وہ کیا بار بار کہتا ہے۔ تکرار شعور بناتی ہے، اور شعور رویّے۔ جب کسی ایک طبقے کو مسلسل مسئلے، خطرے یا استثنا کے طور پر پیش کیا جائے، تو وہ آہستہ آہستہ اجتماعی ذہن میں اسی صورت میں ثبت ہو جاتا ہے۔ مسلمانوں کے ساتھ یہی ہوا۔

خبری چینلز نے واقعات کو سیاق سے الگ کر کے دکھانا شروع کیا۔ کسی فرد کا جرم پوری کمیونٹی کی نمائندگی بن گیا، اور کسی ایک واقعے کو تاریخ کے تسلسل سے کاٹ کر پیش کیا گیا۔ یہ عمل بظاہر صحافتی انتخاب تھا، مگر درحقیقت یہ بیانیاتی تشکیل تھی۔ مسلمان اب فرد نہیں رہے، بلکہ ایک مستقل خبر بن گئے— ایسی خبر جو

ہمیشہ کسی نہ کسی مسئلے سے جڑی ہوتی ہے۔

ٹاک شوز اس عمل کے سب سے نمایاں مظہر بنے۔ بحث کے نام پر شور، سوال کے نام پر الزام، اور مکالمے کے نام پر محاصرہ — یہ وہ فضا تھی جس میں مسلمان مدعوکم اور مدعا زیادہ بنے۔ ان کی موجودگی اکثر توازن کے لیے ہوتی، مگر گفتگو کی سمت پہلے ہی طے ہوتی۔ اس عمل نے نہ صرف مسلمانوں کو غیر محفوظ کیا، بلکہ عوامی مکالمے کو بھی سطحی بنا دیا۔

سوشل میڈیا نے اس رجحان کو مزید تیز کر دیا۔ یہاں رفتار سچائی پر سبقت لے گئی، اور جذبات نے حقائق کی جگہ لے لی۔ افواہیں، ادھوری ویڈیوز، اور جذباتی نعروں نے ایک ایسی دنیا تشکیل دی جہاں نفرت فوری اور ذمہ داری غائب ہوگئی۔ مسلمان اس ڈیجیٹل ہجوم میں سب سے آسان ہدف ثابت ہوئے، کیونکہ پہلے سے موجود بیانیہ ان کے خلاف تیار تھا۔

یہاں نفرت محض ذاتی جذبہ نہیں رہی، بلکہ ایک منظّم صنعت بن گئی۔ ویوز، ریٹنگز اور فالوورز کی دوڑ میں اشتعال سب سے قیمتی شے بن گیا۔ جتنا بڑا الزام، اتنی زیادہ توجہ۔ اور چونکہ مسلمان پہلے ہی دوسرے کے طور پر پیش کیے جا چکے تھے، اس لیے ان کے خلاف بیانیہ فروخت کرنا آسان ہو گیا۔

اس بیانیے کا ایک اہم پہلو خاموشی بھی ہے۔ بہت سے واقعات جو مسلمانوں کے خلاف پیش آئے، وہ یا تو رپورٹ ہی نہیں ہوئے، یا اس طرح

پیش کیے گئے کہ اصل مسئلہ دھندلا گیا۔ تشدد کو جھڑپ کہا گیا، نفرت کو ردِعمل، اور منظّم کارروائی کو عوامی غصہ۔ یہ زبان حقیقت کو نہیں چھپاتی، بلکہ اسے قابلِ قبول بناتی ہے۔

میڈیا کی یہ یک رخی پیشکش سماج پر گہرے اثرات چھوڑتی ہے۔ جب ایک عام ناظر روزانہ ایک ہی قسم کی کہانی دیکھتا ہے، تو اس کے لیے متبادل سوچنا مشکل ہو جاتا ہے۔ یوں تعصب رائے نہیں رہتا، بلکہ فطری ردِعمل بن جاتا ہے۔ مسلمان کے بارے میں شک اب سکھایا نہیں جاتا، بلکہ محسوس کروایا جاتا ہے۔

اس عمل کا نفسیاتی پہلو بھی اہم ہے۔ مسلمان خود کو مسلسل وضاحت کی حالت میں پاتے ہیں۔ انہیں ہر واقعے پر اپنا تعلق واضح کرنا پڑتا ہے، ہر الزام سے فاصلہ دکھانا پڑتا ہے، اور ہر سوال کا جواب دینا پڑتا ہے۔ یہ ذہنی دباؤ کسی ایک دن میں ختم نہیں ہوتا، بلکہ مستقل حالت بن جاتا ہے۔

یہی دباؤ خود سنسر شپ کو جنم دیتا ہے۔ مسلمان بولنے سے پہلے سوچتے ہیں کہ بات کو کیسے لیا جائے گا، خاموش رہنے کو ترجیح دیتے ہیں، اور اختلاف سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ خاموشی بقا کی حکمتِ عملی ہوتی ہے، مگر اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ عوامی مکالمے سے ایک پوری آواز غائب ہو جاتی ہے۔

ادبی، ثقافتی اور تفریحی ذرائع بھی اس بیانیے سے مکمل طور پر محفوظ نہیں رہے۔ فلموں، ویب سیریز اور کہانیوں میں مسلمان کردار اکثر مخصوص سانچوں

میں دکھائے گئے—یا تو شدت پسند، یا پسماندہ، یا مزاحیہ۔ پیچیدگی، تنوع اور انسانیت کم ہوتی گئی۔ اس نمائندگی نے حقیقی زندگی کے تعصّبات کو مزید تقویت دی۔

یہاں سوال یہ نہیں کہ میڈیا جان بوجھ کر نفرت پھیلا رہا ہے یا نہیں، بلکہ یہ ہے کہ وہ اپنے اثرات کی ذمہ داری قبول کرتا ہے یا نہیں۔ جب طاقت بغیر احتساب کے ہو، تو وہ لاپروا ہو جاتی ہے۔ اور میڈیا کی طاقت اسی لاپرواہی میں خطرناک بن جاتی ہے۔

ریاست اور میڈیا کے تعلق نے بھی اس فضا کو متاثر کیا۔ جب حکومتی بیانیہ اور میڈیا کا بیانیہ ایک دوسرے کے قریب آ جائیں، تو اختلاف کی گنجائش کم ہو جاتی ہے۔ تنقید غداری، سوال بد نیتی، اور اختلاف انتشار بن جاتا ہے۔ اس ماحول میں مسلمان سب سے زیادہ غیر محفوظ ہوتے ہیں، کیونکہ ان کی بات پہلے ہی شک کے دائرے میں ہوتی ہے۔

یہ باب اس نکتے پر زور دیتا ہے کہ بیانیہ محض الفاظ کا مجموعہ نہیں، بلکہ حقیقت کی تعمیر ہے۔ جو کہا جاتا ہے، وہی دیکھا جاتا ہے، اور جو بار بار دکھایا جاتا ہے، وہی سچ سمجھا جاتا ہے۔ مسلمانوں کے خلاف بننے والا بیانیہ اسی تکرار کا نتیجہ ہے۔

اس کے اثرات طویل المدت ہیں۔ یہ نسلوں کے ذہنوں میں بیٹھتا ہے، تعلقات کو متاثر کرتا ہے، اور مستقبل کی سیاست کو شکل دیتا ہے۔ جو بچہ آج اس بیانیے میں بڑا ہوتا ہے، وہ کل اسی کو معمول سمجھتا ہے۔ یوں عدمِ تحفظ ایک وقتی

کیفیت نہیں رہتا، بلکہ ایک مستقل ماحول بن جاتا ہے۔

باب ششم اسی ماحول کی تشریح ہے۔ یہ دکھاتا ہے کہ خوف کیسے بنایا جاتا ہے، کیسے بیچا جاتا ہے، اور کیسے معمول بنا دیا جاتا ہے۔ یہ باب یہ بھی واضح کرتا ہے کہ جب زبان زخمی ہو جائے، تو تشدد صرف جسمانی نہیں رہتا—وہ ذہنی اور سماجی بھی ہو جاتا ہے۔

یہاں سے کتاب ایک اور گہرے مرحلے میں داخل ہوتی ہے۔ اگلا باب اس سوال سے جڑے گا کہ شناخت، تاریخ اور مذہب کو کس طرح سیاسی اور سماجی ہتھیار میں بدلا جاتا ہے، اور اس کے نتائج کیا ہوتے ہیں۔ کیونکہ بیانیہ وہ زمین تیار کرتا ہے جس پر شناخت کی سیاست پنپتی ہے۔

باب ششم اسی زمین کی نقشہ کشی ہے— مکمل، خودمختار اور فیصلہ کن۔

باب ہفتم:

شناخت کی سیاست:

تاریخ، مذہب اور معنی کی جنگ

ہر معاشرہ اپنی شناخت تاریخ سے اخذ کرتا ہے، مگر مسئلہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب تاریخ کو یادداشت کے بجائے ہتھیار بنالیا جائے۔ تاریخ اگر سوال پیدا کرے تو شعور بیدار کرتی ہے، اور اگر جواب مسلط کرے تو تعصب جنم دیتی ہے۔ بھارت میں شناخت کی سیاست اسی دوسرے راستے پر چلتی دکھائی دیتی ہے، جہاں تاریخ کی تعبیر ایک فکری عمل نہیں، بلکہ ایک سیاسی منصوبہ بن چکی ہے۔

مسلمانوں کے عدمِ تحفظ کی جڑیں صرف حال میں نہیں، بلکہ اس ماضی میں پیوست ہیں جسے بار بار نئے معنی دیے جا رہے ہیں۔ یہاں مسئلہ تاریخ کا ہونا نہیں، بلکہ اس کا چناؤ ہے۔ کون سا واقعہ یاد رکھا جائے، کس کو فراموش کیا جائے، اور کس کو جرم بنا کر پیش کیا جائے — یہ سب فیصلے اب مورخ نہیں، سیاست دان کرتے ہیں۔

مسلمانوں کی شناخت کو زیادہ تر ایک ''تاریخی مسئلے'' کے طور پر پیش کیا گیا۔ انہیں شہری کم اور وارثِ ماضی زیادہ سمجھا گیا — ایسے ماضی کا جسے یک رخی انداز میں دکھایا گیا۔ صدیوں پر محیط مشترکہ تہذیب، زبان، فن، علم اور سماجی میل جول کو پس منظر میں دھکیل دیا گیا، اور چند واقعات کو پورے عہد کی نمائندگی بنا دیا

گیا۔ یوں تاریخ انسانوں کی کہانی نہیں رہی، بلکہ الزامات کی فہرست بن گئی۔

یہاں مذہب ایک مرکزی کردار ادا کرتا ہے۔ مذہب جو ذاتی ایمان اور اخلاقی رہنمائی کا ذریعہ ہونا چاہیے تھا، اسے اجتماعی شناخت کی سخت لکیر میں بدل دیا گیا۔ ہندو ہونا ثقافتی معیار، اور مسلمان ہونا سیاسی سوال بنا دیا گیا۔ یہ فرق محض الفاظ کا نہیں، بلکہ حیثیت کا ہے۔ ایک شناخت قدرتی ٹھہری، دوسری وضاحت طلب۔

مذہب کے اس سیاسی استعمال نے ایک نیا تصور جنم دیا: اکثریتی اخلاقیات۔ اس تصور کے تحت اکثریت کا احساسِ ناراضی اخلاقی جواز بن گیا، اور اقلیت کا وجود ایک رعایت۔ مسلمان اس رعایت کے دائرے میں جینے لگے—جہاں حقوق مستقل نہیں، بلکہ مشروط ہوتے ہیں۔

شناخت کی سیاست کا سب سے خطرناک پہلو یہ ہے کہ یہ سوال کو جرم میں بدل دیتی ہے۔ اگر مسلمان اپنی تاریخ کا مختلف زاویہ پیش کریں تو انہیں دفاعی کہا جاتا ہے، اگر وہ خاموش رہیں تو انہیں مجرم سمجھا جاتا ہے۔ اس دوہرے معیار نے مکالمے کی گنجائش ختم کر دی۔ تاریخ اب بحث کا موضوع نہیں، بلکہ فیصلہ بن چکی ہے۔

تعلیمی ادارے اس سیاست سے محفوظ نہ رہ سکے۔ نصاب میں تبدیلیاں، اصطلاحات کا چناؤ، اور بعض ادوار کی غیر موجودگی—یہ سب اس بات کی علامت ہیں کہ تاریخ کو ایک خاص شناخت کی خدمت میں لگا دیا گیا

ہے۔ جب طالب علم یک رخا تاریخ پڑھتا ہے، تو وہ تنوع کو فطری نہیں سمجھتا۔ یوں شناخت تعصب میں بدلنے لگتی ہے۔

مسلمان اس عمل میں صرف موضوع نہیں، بلکہ ہدف بن جاتے ہیں۔ ان سے بار بار یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ ماضی پر معذرت خواہ ہوں، حال میں خاموش رہیں، اور مستقبل میں وفاداری ثابت کریں۔ یہ مطالبات کسی تحریری قانون میں نہیں، مگر سماجی فضا میں واضح طور پر موجود ہیں۔

یہی سیاست مذہبی علامات پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ عبادت، لباس، تہوار—یہ سب ذاتی اظہار کے بجائے عوامی بیانات بنا دیے جاتے ہیں۔ مسلمان کی مذہبی زندگی ایک مستقل نگرانی میں آ جاتی ہے، جہاں ہر عمل کی تعبیر باہر سے کی جاتی ہے۔ یہ نگرانی عدمِ تحفظ کو روزمرہ تجربہ بنا دیتی ہے۔

شناخت کی سیاست کا ایک اور پہلو ہم اور وہ کی تقسیم ہے۔ یہ تقسیم ابتدا میں فکری ہوتی ہے، مگر وقت کے ساتھ اخلاقی بن جاتی ہے۔ ہم درست، محبِ وطن اور وارث ٹھہرتے ہیں، اور وہ مشکوک، بیرونی اور خطرہ۔ اس تقسیم میں مسلمان ہمیشہ وہ کے خانے میں رکھے جاتے ہیں، چاہے ان کی نسلیں اسی سرزمین میں کیوں نہ گزری ہوں۔

یہاں تاریخ کا استعمال محض ماضی کو سمجھنے کے لیے نہیں، بلکہ حال کو کنٹرول کرنے کے لیے کیا جاتا ہے۔ جو گروہ ماضی میں طاقتور دکھایا جائے، وہ

حال میں بھی برتری کا دعویدار بنتا ہے۔اور جسے ماضی میں مجرم ثابت کیا جائے، اس سے حال میں جواب طلبی کی جاتی ہے۔مسلمان اس سیاسی منطق میں مسلسل جواب دہ بنے رہتے ہیں۔

اس عمل کا نفسیاتی اثر گہرا ہے۔جب کسی فرد کی شناخت کو مسلسل سوالیہ نشان بنایا جائے، تو وہ خود کو مکمل شہری محسوس نہیں کر پاتا۔اس کی وابستگی مشروط، اور اس کی قبولیت عارضی ہو جاتی ہے۔یہ کیفیت اجتماعی سطح پر پھیل کر کمیونٹی کے اعتماد کو کمزور کر دیتی ہے۔

شناخت کی سیاست صرف نفرت نہیں پھیلاتی، بلکہ سادہ حقیقتوں کو پیچیدہ بنا دیتی ہے۔مشترکہ تاریخ، باہمی انحصار، اور ثقافتی ہم آہنگی جیسے حقائق غیر متعلق سمجھے جانے لگتے ہیں۔یوں معاشرہ اپنی اصل طاقت—تنوع—سے محروم ہونے لگتا ہے۔

یہ باب اس نکتے پر بھی روشنی ڈالتا ہے کہ شناخت کی سیاست خود اکثریت کے لیے بھی نقصان دہ ہے۔جب تاریخ کو فخر کے بجائے غصے کا ذریعہ بنایا جائے، تو معاشرہ تخلیق کے بجائے تصادم کی طرف بڑھتا ہے۔یہ راستہ نہ امن دیتا ہے، نہ ترقی—صرف مسلسل بے چینی۔

مسلمانوں کے لیے یہ سیاست ایک دوہرے محاذ پر لڑائی بن جاتی ہے۔ایک طرف انہیں اپنے وجود کا دفاع کرنا پڑتا ہے، دوسری طرف انہیں اس دفاع

کو جارحیت سمجھنے سے بچنا پڑتا ہے۔ یہ توازن تھکا دینے والا ہے، اور اسی تھکن میں عدمِ تحفظ گہرا ہوتا جاتا ہے۔

یہ باب کسی ایک جماعت یا نظریے کا محاسبہ نہیں، بلکہ ایک رجحان کی نشاندہی ہے—وہ رجحان جو شناخت کو جامد، تاریخ کو مقدس، اور مذہب کو سیاسی بناتا ہے۔ یہ رجحان اگر چیلنج نہ ہو تو وہ مستقبل کو بھی اسی سانچے میں ڈھال دیتا ہے۔

یہاں سے کتاب ایک اہم موڑ لیتی ہے۔ اگلے ابواب میں ہم دیکھیں گے کہ اس شناختی سیاست کے اثرات نوجوان نسل، معیشت، سیاسی شرکت اور مستقبل کے امکانات پر کیسے مرتب ہوتے ہیں۔ کیونکہ جب شناخت طے کر دی جائے، تو امکانات بھی محدود ہو جاتے ہیں۔

باب ہفتم اسی حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ مسلمانوں کا عدمِ تحفظ محض حالات کا نتیجہ نہیں، بلکہ ایک سوچے سمجھے فکری و سیاسی عمل کا حاصل ہے۔ یہ باب اختتام نہیں، بلکہ ایک فکری دروازہ ہے—وہ دروازہ جس سے گزر کر ہم اس سوال تک پہنچیں گے کہ اس فضا میں مستقبل کیسا ہو سکتا ہے۔

اور یہی سوال، آخرکار، باب دوازدہم میں اپنے مکمل جواب کی طرف بڑھے گا۔

باب ہشتم:

نوجوان نسل:

امید، خوف اور خاموش مزاحمت

نوجوان نسل ہر معاشرے کا آئینہ بھی ہوتی ہے اور امکان بھی۔ وہ حال کی سچائی کو جیتی ہے اور مستقبل کے امکانات کو اپنے اندر سموئے رکھتی ہے۔ جب کسی سماج میں بحران گہرا ہو جائے تو اس کا سب سے پہلا اور سب سے دیرپا اثر نوجوانوں پر پڑتا ہے، کیونکہ وہی وہ طبقہ ہوتا ہے جو ابھی شناخت کی تشکیل کے مرحلے میں ہوتا ہے۔ بھارت میں مسلمانوں کے عدمِ تحفظ کا سوال اسی لیے سب سے زیادہ سنجیدہ شکل نوجوان نسل میں اختیار کرتا ہے، جہاں امید اور خوف ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔

مسلمان نوجوان ایک ایسی فضا میں جوان ہو رہے ہیں جہاں سوال ان کی قابلیت کا نہیں، بلکہ ان کی وابستگی کا ہے۔ وہ تعلیمی اداروں میں داخل ہوتے ہیں تو ان کے نام، لباس یا رہن سہن سے پہلے ہی ان کے بارے میں ایک تصور قائم کر لیا جاتا ہے۔ یہ تصور ہمیشہ واضح الفاظ میں نہیں ہوتا، مگر رویّوں میں جھلک جاتا ہے۔ کلاس روم میں خاموشی، ہوسٹل میں فاصلہ، اور مباحثوں میں انتخابی شمولیت—یہ سب اس بات کے اشارے ہیں کہ نوجوان مسلمان مکمل طور پر غیر جانبدار ماحول میں سانس نہیں لے رہا۔

یہ فضا نوجوان ذہن کو دو حصوں میں بانٹ دیتی ہے۔ ایک حصہ وہ ہے جو آگے بڑھنا چاہتا ہے، تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہے، اپنے خوابوں کو حقیقت میں بدلنا چاہتا ہے۔ دوسرا حصہ وہ ہے جو مسلسل محتاط رہتا ہے، جو ہر قدم سے پہلے یہ سوچتا ہے کہ کہیں اس کی شناخت اس کے راستے میں رکاوٹ نہ بن جائے۔ یہ داخلی کشمکش نہ صرف ذہنی دباؤ پیدا کرتی ہے، بلکہ خوداعتمادی کو بھی آہستہ آہستہ کمزور کرتی ہے۔

خوف اس نسل کا ایک مستقل ساتھی بن چکا ہے، مگر یہ خوف ہمیشہ شور نہیں مچاتا۔ اکثر یہ خاموش ہوتا ہے۔ یہ خوف اس وقت ظاہر ہوتا ہے جب نوجوان کسی مظاہرے میں شامل ہونے سے پہلے دس بار سوچتا ہے، جب وہ سوشل میڈیا پر رائے دینے سے گریز کرتا ہے، یا جب وہ اپنے کیریئر کے انتخاب میں ایسے راستے چنتا ہے جو کم نظر آئیں مگر زیادہ محفوظ ہوں۔ یہ خوف بزدلی نہیں، بلکہ حالات کا نتیجہ ہے—ایسے حالات جہاں قیمت ہمیشہ ایک جیسی نہیں ہوتی۔

اس کے باوجود امید مکمل طور پر ختم نہیں ہوئی۔ یہ امید چھوٹے چھوٹے دائروں میں زندہ ہے۔ مطالعے کے حلقوں میں، ثقافتی سرگرمیوں میں، سماجی خدمت کے کاموں میں، اور ان خاموش کوششوں میں جو شہ سرخی نہیں بنتیں مگر زندگی کو سہارا دیتی ہیں۔ مسلمان نوجوانوں میں ایک واضح رجحان یہ بھی ہے کہ وہ خود کو صرف شکایت کے دائرے میں محدود نہیں رکھنا چاہتے۔ وہ اپنی شناخت کو

علم، ہنر اور کردار کے ذریعے منوانا چاہتے ہیں۔

یہی امید مزاحمت کی ایک نئی شکل کو جنم دیتی ہے۔ یہ مزاحمت سڑکوں پر نعرے لگانے تک محدود نہیں، بلکہ روزمرہ فیصلوں میں جھلکتی ہے۔ بہتر تعلیم حاصل کرنے کی ضد، پیشہ ورانہ مہارت میں کمال حاصل کرنے کی کوشش، اور سماجی خدمت کے ذریعے اپنی موجودگی کا احساس دلانا——یہ سب مزاحمت کی وہ صورتیں ہیں جو خاموش ہیں مگر گہری ہیں۔

البتہ یہ مزاحمت آسان نہیں۔ اس کے لیے مسلسل صبر، خوداحتسابی اور حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے۔ نوجوان مسلمان جانتے ہیں کہ ان سے غلطی کی گنجائش کم ہے۔ ایک فرد کی لغزش پوری کمیونٹی کے کھاتے میں ڈال دی جاتی ہے۔ اس لیے وہ نہ صرف اپنے لیے بلکہ دوسروں کے لیے بھی ذمہ داری کا بوجھ اٹھاتے ہیں۔ یہ بوجھ عمر سے پہلے پختگی تو دیتا ہے، مگر خوشیوں کو محدود بھی کر دیتا ہے۔

سیاسی سطح پر نوجوانوں کی شمولیت بھی اسی خوف اور امید کے درمیان معلق ہے۔ کچھ نوجوان خود کو سیاست سے دور رکھتے ہیں، کیونکہ وہ اسے خطرناک سمجھتے ہیں۔ کچھ اس میں شامل ہونا چاہتے ہیں، مگر مناسب پلیٹ فارم نہ ہونے کے باعث حاشیے پر رہ جاتے ہیں۔ اس خلا کا نقصان صرف نوجوانوں کو نہیں، بلکہ جمہوری عمل کو بھی ہوتا ہے، کیونکہ ایک بڑی آبادی کی آواز پوری طرح شامل نہیں ہو پاتی۔

یہ نسل میڈیا کے اثر سے بھی گہرا تعلق رکھتی ہے۔ ایک طرف وہ نفرت آمیز بیانیے کا ہدف بنتی ہے، دوسری طرف وہی ڈیجیٹل دنیا اسے متبادل آوازیں تلاش کرنے کا موقع بھی دیتی ہے۔ یہاں نوجوان مسلمان اپنی کہانیاں خود بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اپنی شناخت کو ایک رخ تک محدود نہیں ہونے دیتے، اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ محض ردعمل نہیں، بلکہ تخلیق بھی کر سکتے ہیں۔

خواتین نوجوانوں کے لیے یہ سفر مزید پیچیدہ ہو جاتا ہے۔ وہ تعلیم، روزگار اور سماجی شمولیت کے ساتھ ساتھ شناختی سیاست کے اضافی دباؤ کا سامنا کرتی ہیں۔ اس کے باوجود، وہ اس دور کی سب سے متحرک اور باخبر آوازوں میں شامل ہیں۔ ان کی موجودگی اس بات کی دلیل ہے کہ امید اب بھی زندہ ہے، چاہے اس کی قیمت زیادہ کیوں نہ ہو۔

یہ باب اس حقیقت کو بھی اجاگر کرتا ہے کہ نوجوان نسل محض متاثرہ فریق نہیں، بلکہ مستقبل کی تشکیل میں ایک فعال قوت بھی ہے۔ مگر یہ قوت اسی وقت مثبت سمت میں کام کر سکتی ہے جب اسے جگہ، اعتماد اور تحفظ میسر ہو۔ اگر خوف غالب رہا تو یہ نسل یا تو خاموش ہو جائے گی یا خود کو الگ تھلگ کر لے گی، اور دونوں صورتیں سماج کے لیے نقصان دہ ہیں۔

مسلمان نوجوانوں کا سب سے بڑا امتحان یہ ہے کہ وہ اپنی شناخت کو

دفاعی خول میں قید نہ ہونے دیں۔ وہ تاریخ کے بوجھ تلے دبنے کے بجائے حال میں جینے اور مستقبل بنانے کی کوشش کریں۔ یہ آسان راستہ نہیں، مگر شاید یہی واحد راستہ ہے جو انہیں محض زندہ رہنے کے بجائے باوقار زندگی کی طرف لے جا سکتا ہے۔

یہ باب کسی رومانوی امید کا وعدہ نہیں کرتا، اور نہ ہی کسی فوری حل کا دعویٰ کرتا ہے۔ یہ صرف اس حقیقت کو سامنے رکھتا ہے کہ بحران کا اصل اثر نوجوان ذہنوں پر پڑتا ہے، اور اگر یہی ذہن مکمل طور پر خوف کے حوالے کر دیے جائیں تو معاشرہ اپنا مستقبل خود کمزور کر لیتا ہے۔

یہاں سے کتاب ایک ایسے مرحلے کی طرف بڑھتی ہے جہاں سوال یہ نہیں رہے گا کہ مسئلہ کیا ہے، بلکہ یہ کہ اس مسئلے کے ساتھ جیا کیسے جائے، اور اسے بدلا کیسے جائے۔ نوجوان نسل کی امید، خوف اور مزاحمت اسی سوال کا پہلا جواب ہیں۔

یہی جواب آگے چل کر ان تمام ابواب کو ایک دھاگے میں پروئے گا، جو آخرکار کتاب کے آخری باب میں ایک جامع نچوڑ کی صورت سامنے آئے گا — جہاں حال کی تلخی، ماضی کی تفہیم اور مستقبل کی ذمہ داری ایک جگہ جمع ہوں گی۔

باب نہم:

معیشت، روزگار، غربت، سماجی زوال اور مسلمانوں کی اقتصادی غیر محفوظیت

نوجوان نسل ہر معاشرے کا آئینہ بھی ہوتی ہے اور امکان بھی۔ وہ حال کی سچائی کو جیتی ہے اور مستقبل کے امکانات کو اپنے اندر سموئے رکھتی ہے۔ جب کسی سماج میں بحران گہرا ہو جائے تو اس کا سب سے پہلا اور سب سے دیرپا اثر نوجوانوں پر پڑتا ہے، کیونکہ وہی وہ طبقہ ہوتا ہے جو ابھی شناخت کی تشکیل کے مرحلے میں ہوتا ہے۔ بھارت میں مسلمانوں کے عدمِ تحفظ کا سوال اسی لیے سب سے زیادہ سنجیدہ شکل نوجوان نسل میں اختیار کرتا ہے، جہاں امید اور خوف ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔

مسلمان نوجوان ایک ایسی فضا میں جوان ہو رہے ہیں جہاں سوال ان کی قابلیت کا نہیں، بلکہ ان کی وابستگی کا ہے۔ وہ تعلیمی اداروں میں داخل ہوتے ہیں تو ان کے نام، لباس یا رہن سہن سے پہلے ہی ان کے بارے میں ایک تصور قائم کر لیا جاتا ہے۔ یہ تصور ہمیشہ واضح الفاظ میں نہیں ہوتا، مگر رویّوں میں جھلک جاتا ہے۔ کلاس روم میں خاموشی، ہوسٹل میں فاصلہ، اور مباحثوں میں انتخابی شمولیت — یہ سب اس بات کے اشارے ہیں کہ نوجوان مسلمان مکمل طور پر غیر جانبدار ماحول میں سانس نہیں لے رہا۔

یہ فضا نوجوان ذہن کو دو حصوں میں بانٹ دیتی ہے۔ ایک حصہ وہ ہے جو آگے بڑھنا چاہتا ہے، تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہے، اپنے خوابوں کو حقیقت میں بدلنا چاہتا ہے۔ دوسرا حصہ وہ ہے جو مسلسل محتاط رہتا ہے، جو ہر قدم سے پہلے یہ سوچتا ہے کہ کہیں اس کی شناخت اس کے راستے میں رکاوٹ نہ بن جائے۔ یہ داخلی کشمکش نہ صرف ذہنی دباؤ پیدا کرتی ہے، بلکہ خوداعتمادی کو بھی آہستہ آہستہ کمزور کرتی ہے۔

خوف اس نسل کا ایک مستقل ساتھی بن چکا ہے، مگر یہ خوف ہمیشہ شور نہیں مچاتا۔ اکثر یہ خاموش ہوتا ہے۔ یہ خوف اس وقت ظاہر ہوتا ہے جب نوجوان کسی مظاہرے میں شامل ہونے سے پہلے دس بار سوچتا ہے، جب وہ سوشل میڈیا پر رائے دینے سے گریز کرتا ہے، یا جب وہ اپنے کیریئر کے انتخاب میں ایسے راستے چنتا ہے جو کم نظر آئیں مگر زیادہ محفوظ ہوں۔ یہ خوف بزدلی نہیں، بلکہ حالات کا نتیجہ ہے—ایسے حالات جہاں قیمت ہمیشہ ایک جیسی نہیں ہوتی۔

اس کے باوجود امید مکمل طور پر ختم نہیں ہوئی۔ یہ امید چھوٹے چھوٹے دائروں میں زندہ ہے۔ مطالعے کے حلقوں میں، ثقافتی سرگرمیوں میں، سماجی خدمت کے کاموں میں، اور ان خاموش کوششوں میں جو شہ سرخی نہیں بنتیں مگر زندگی کو سہارا دیتی ہیں۔ مسلمان نوجوانوں میں ایک واضح رجحان یہ بھی ہے کہ وہ خود کو صرف شکایت کے دائرے میں محدود نہیں رکھنا چاہتے۔ وہ اپنی شناخت کو

علم، ہنر اور کردار کے ذریعے منوانا چاہتے ہیں۔

یہی امید مزاحمت کی ایک نئی شکل کو جنم دیتی ہے۔ یہ مزاحمت سڑکوں پر نعرے لگانے تک محدود نہیں، بلکہ روزمرہ فیصلوں میں جھلکتی ہے۔ بہتر تعلیم حاصل کرنے کی ضد، پیشہ ورانہ مہارت میں کمال حاصل کرنے کی کوشش، اور سماجی خدمت کے ذریعے اپنی موجودگی کا احساس دلانا — یہ سب مزاحمت کی وہ صورتیں ہیں جو خاموش ہیں مگر گہری ہیں۔

البتہ یہ مزاحمت آسان نہیں۔ اس کے لیے مسلسل صبر، خوداحتسابی اور حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے۔ نوجوان مسلمان جانتے ہیں کہ ان سے غلطی کی گنجائش کم ہے۔ ایک فرد کی لغزش پوری کمیونٹی کے کھاتے میں ڈال دی جاتی ہے۔ اس لیے وہ نہ صرف اپنے لیے بلکہ دوسروں کے لیے بھی ذمہ داری کا بوجھ اٹھاتے ہیں۔ یہ بوجھ عمر سے پہلے پختگی تو دیتا ہے، مگر خوشیوں کو محدود بھی کر دیتا ہے۔

سیاسی سطح پر نوجوانوں کی شمولیت بھی اسی خوف اور امید کے درمیان معلق ہے۔ کچھ نوجوان خود کو سیاست سے دور رکھتے ہیں، کیونکہ وہ اسے خطرناک سمجھتے ہیں۔ کچھ اس میں شامل ہونا چاہتے ہیں، مگر مناسب پلیٹ فارم نہ ہونے کے باعث حاشیے پر رہ جاتے ہیں۔ اس خلا کا نقصان صرف نوجوانوں کو نہیں، بلکہ جمہوری عمل کو بھی ہوتا ہے، کیونکہ ایک بڑی آبادی کی آواز پوری طرح شامل نہیں ہو پاتی۔

یہ نسل میڈیا کے اثر سے بھی گہرا تعلق رکھتی ہے۔ ایک طرف وہ نفرت آمیز بیانیے کا ہدف بنتی ہے، دوسری طرف وہی ڈیجیٹل دنیا اسے متبادل آوازیں تلاش کرنے کا موقع بھی دیتی ہے۔ یہاں نوجوان مسلمان اپنی کہانیاں خود بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اپنی شناخت کو ایک رخ تک محدود نہیں ہونے دیتے، اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ محض ردعمل نہیں، بلکہ تخلیق بھی کر سکتے ہیں۔

خواتین نوجوانوں کے لیے یہ سفر مزید پیچیدہ ہو جاتا ہے۔ وہ تعلیم، روزگار اور سماجی شمولیت کے ساتھ ساتھ شناختی سیاست کے اضافی دباؤ کا سامنا کرتی ہیں۔ اس کے باوجود، وہ اس دور کی سب سے متحرک اور باخبر آوازوں میں شامل ہیں۔ ان کی موجودگی اس بات کی دلیل ہے کہ امید اب بھی زندہ ہے، چاہے اس کی قیمت زیادہ کیوں نہ ہو۔

یہ باب اس حقیقت کو بھی اجاگر کرتا ہے کہ نوجوان نسل محض متاثرہ فریق نہیں، بلکہ مستقبل کی تشکیل میں ایک فعال قوت بھی ہے۔ مگر یہ قوت اسی وقت مثبت سمت میں کام کر سکتی ہے جب اسے جگہ، اعتماد اور تحفظ میسر ہو۔ اگر خوف غالب رہا تو یہ نسل یا تو خاموش ہو جائے گی یا خود کو الگ تھلگ کر لے گی، اور دونوں صورتیں سماج کے لیے نقصان دہ ہیں۔

مسلمان نوجوانوں کا سب سے بڑا امتحان یہ ہے کہ وہ اپنی شناخت کو

دفاعی خول میں قید نہ ہونے دیں۔ وہ تاریخ کے بوجھ تلے دبنے کے بجائے حال میں جینے اور مستقبل بنانے کی کوشش کریں۔ یہ آسان راستہ نہیں، مگر شاید یہی واحد راستہ ہے جو انہیں محض زندہ رہنے کے بجائے باوقار زندگی کی طرف لے جا سکتا ہے۔

یہ باب کسی رومانوی امید کا وعدہ نہیں کرتا، اور نہ ہی کسی فوری حل کا دعویٰ کرتا ہے۔ یہ صرف اس حقیقت کو سامنے رکھتا ہے کہ بحران کا اصل اثر نوجوان ذہنوں پر پڑتا ہے، اور اگر یہی ذہن مکمل طور پر خوف کے حوالے کر دیے جائیں تو معاشرہ اپنا مستقبل خود کمزور کر لیتا ہے۔

یہاں سے کتاب ایک ایسے مرحلے کی طرف بڑھتی ہے جہاں سوال یہ نہیں رہے گا کہ مسئلہ کیا ہے، بلکہ یہ کہ اس مسئلے کے ساتھ جیا کیسے جائے، اور اسے بدلا کیسے جائے۔ نوجوان نسل کی امید، خوف اور مزاحمت اسی سوال کا پہلا جواب ہیں۔

یہی جواب آگے چل کر ان تمام ابواب کو ایک دھاگے میں پروئے گا، جو آخر کار کتاب کے آخری باب میں ایک جامع نچوڑ کی صورت سامنے آئے گا — جہاں حال کی تلخی، ماضی کی تفہیم اور مستقبل کی ذمہ داری ایک جگہ جمع ہوں گی۔

باب دہم:

تعلیم اور علمی ترقی کی راہ میں رکاوٹیں

بھارت میں مسلمانوں کی تعلیمی و علمی حالت ایک تاریخی اور اجتماعی مسئلہ رہی ہے۔ اگرچہ برصغیر کی تاریخ میں مسلمانوں نے علمی، ادبی، اور فنی میدانوں میں اہم کردار ادا کیا، لیکن تقسیم ہند کے بعد اور آزاد بھارت میں کئی عوامل نے ان کی تعلیمی ترقی اور معاشرتی آگہی پر منفی اثرات مرتب کیے۔

تعلیمی اداروں میں کم سرمایہ کاری، نصاب کی سیاسی اور مذہبی کشیدگی، اور تعلیمی پالیسیوں میں پس ماندگی نے مسلمانوں کی علمی ترقی کو محدود کیا۔ تحقیق سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ بھارتی مسلمانوں کی تعلیمی شرح، خصوصاً خواتین کی تعلیم میں، دیگر معاشرتی طبقات کے مقابلے میں نمایاں طور پر کم ہے۔ تاریخی اور سرکاری اعداد و شمار یہ واضح کرتے ہیں کہ تعلیمی مواقع میں عدم مساوات اور سماجی امتیاز نے علم و فہم کی راہوں میں مستقل رکاوٹیں کھڑی کی ہیں۔

مسلمان نوجوانوں کی امیدیں اور محرومیاں اکثر اسی تعلیمی پس منظر سے جڑی ہوتی ہیں۔ تعلیم کی کمی نہ صرف معاشی مواقع کو محدود کرتی ہے بلکہ سیاسی اور سماجی شراکت داری میں بھی رکاوٹ بنتی ہے۔ تعلیمی محرومیت کے نتیجے میں وہ معاشرتی ہم آہنگی میں کمزور پڑ جاتے ہیں اور سیاسی نمائندگی میں محدود کردار ادا کر

پاتے ہیں۔اس طرح، علمی اور فکری ترقی کی کمی براہ راست سماجی غیر محفوظیت سے جڑی ہے۔

مزید برآں، ہندوستانی نصابوں میں مذہبی تعصب یا تاریخی حقائق کی غیر متوازن تشریح نے مسلمانوں کی ثقافتی اور علمی شناخت پر اثر ڈالا ہے۔نوجوان نسل میں علمی اور ثقافتی شعور کی کمی نے انہیں خوداعتمادی اور اجتماعی بصیرت سے محروم کر دیا ہے۔ یہ صورتحال معاشرتی ہم آہنگی، سیاسی حصہ داری، اور اقتصادی ترقی کے تمام پہلوؤں کو متاثر کرتی ہے۔

تعلیم کی کمی کا اثر صرف فرد یا خاندان تک محدود نہیں بلکہ یہ ایک جماعتی مسئلہ بن گیا ہے۔تاریخی مطالعات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اگر مسلمانوں کو علمی ترقی کے برابر مواقع میسر نہیں آتے،تو سماجی شراکت داری اور معاشرتی ہم آہنگی کمزور ہوتی ہے۔تعلیمی اور فکری طور پر پس ماندہ معاشرہ اکثر سیاسی اور معاشرتی دباؤ کا شکار ہوتا ہے، جو آگے چل کر تشدد،نفرت یا فرقہ وارانہ کشیدگی کے جڑواں مسائل پیدا کر سکتا ہے۔

اس باب میں یہ بھی واضح کیا جائے گا کہ تعلیمی اور علمی ترقی میں رکاوٹیں صرف نصاب یا اداروں تک محدود نہیں بلکہ سماجی رویے، معاشرتی توقعات، اور مذہبی و سیاسی ماحول بھی اس کی راہ میں اہم رکاوٹیں ہیں۔ مثال کے طور پر، مسلمانوں کے لیےاعلی تعلیمی اداروں میں داخلہ اور مالی معاونت کے مواقع محدود ہیں،

جس سے ایک پورے طبقے کی علمی قابلیت اور معاشرتی حصہ داری متاثر ہوتی ہے۔

مزید برآں، معاشرتی اور اقتصادی دباؤ کے باعث بہت سے نوجوان تعلیمی سلسلے کو جاری رکھنے میں ناکام رہ جاتے ہیں۔ اس سے نہ صرف فرد کی ترقی متاثر ہوتی ہے بلکہ مجموعی مسلم کمیونٹی کی سماجی، اقتصادی اور سیاسی غیر محفوظیت میں اضافہ ہوتا ہے۔ تاریخی شواہد سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اگر کسی معاشرے میں علمی اور تعلیمی سرمایہ کاری کم ہو، تو اس معاشرے کی سماجی ہم آہنگی، سیاسی مضبوطی، اور اقتصادی ترقی سب متاثر ہوتی ہیں۔

تعلیمی پس ماندگی کی ایک اہم جہت زبان اور نصاب کی مطابقت بھی ہے۔ بہت سے علاقوں میں مسلمانوں کی مادری زبان اور نصاب کی زبان کے درمیان عدم مطابقت نے علمی مواد تک رسائی کو محدود کیا۔ اس سے نہ صرف تعلیمی معیار متاثر ہوتا ہے بلکہ نوجوان نسل میں علمی اور فکری حوصلہ بھی کمزور پڑتا ہے۔ نتیجتاً، یہ نسل اپنے حقوق، سماجی شراکت داری، اور سیاسی نمائندگی کے لیے کمزور رہ جاتی ہے۔

باب دہم میں یہ بھی زیر بحث آئے گا کہ سماجی شعور اور علمی ترقی کے بغیر معاشرتی بیداری ممکن نہیں۔ تعلیم نہ صرف علم کے حصول کا ذریعہ ہے بلکہ ایک سوشلسٹی، سیاسی اور اقتصادی خودمختاری کا بھی بنیادی ستون ہے۔ بھارت میں مسلمانوں کی تعلیمی پس ماندگی نے انہیں ہر سطح پر غیر محفوظ کر دیا ہے: سماجی

تعلقات، معاشرتی شراکت داری، اقتصادی مواقع اور سیاسی نمائندگی میں۔

باب دہم کے اختتام پر یہ نتیجہ اخذ ہے کہ تعلیمی و علمی ترقی کے مواقع کی کمی ایک سلسلہ وار اثر پیدا کرتی ہے۔ یہ نہ صرف فرد اور خاندان بلکہ پوری مسلم کمیونٹی کی معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی حالت پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اور یہ سلسلہ، جو پچھلے ابواب میں بیان شدہ غیر محفوظیت کے دیگر پہلوؤں سے جڑتا ہے، آگے چل کر باب دوازدہم کے نچوڑ اور کتاب کے مجموعی پیغام کی بنیاد فراہم کرے گا۔

باب یازدہم:

مستقبل کے بھارت میں مسلمانوں کی ممکنہ راہیں اور امیدیں

بھارت میں مسلمانوں کی حالت نے تاریخی، سیاسی اور سماجی عوامل کے سبب پیچیدہ اور متنوع منظر نامہ پیدا کیا ہے۔ پچھلے ابواب میں ہم نے دیکھا کہ مسلمانوں کی غیر محفوظیت کئی جہتوں میں محسوس کی گئی، چاہے وہ تعلیمی، معاشرتی، اقتصادی یا سیاسی میدان ہو۔ باب گیارہ کا مقصد ان تمام پہلوؤں کے پس منظر میں مستقبل کے لیے ممکنہ راستوں کا تفصیلی تجزیہ پیش کرنا ہے۔

مسلمان کمیونٹی کے لیے سب سے بڑی چیلنج سماجی اور اقتصادی شمولیت ہے۔ تاریخ اور موجودہ اعداد و شمار واضح کرتے ہیں کہ اگر یہ کمیونٹی اقتصادی اور سماجی طور پر مستحکم نہیں ہوتی تو سیاسی نمائندگی اور حقوق کا حصول بھی محدود رہتا ہے۔ اس پس منظر میں مستقبل کی راہیں بنیادی طور پر چار سطحوں پر جانی جا سکتی ہیں: تعلیمی و علمی ترقی، اقتصادی خودمختاری، سیاسی شراکت داری، اور سماجی و ثقافتی تحفظ۔

تعلیمی اور علمی ترقی مستقبل کی راہوں کا سب سے مضبوط ستون ہے۔ تعلیمی مواقع کی برابری اور نصاب میں شمولیت مسلمانوں کو نہ صرف فکری آزادی بلکہ معاشرتی اعتماد بھی فراہم کر سکتی ہے۔ تحقیق سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ اعلیٰ تعلیمی اداروں تک رسائی اور فنی و پیشہ ورانہ تربیت نوجوان نسل میں خوداعتمادی

پیدا کرتی ہے اور انہیں معاشرتی و اقتصادی ترقی کی راہ پر گامزن کرتی ہے۔ نوجوانوں میں تعلیمی سرمایہ کاری کے نتیجے میں نہ صرف ذاتی ترقی ممکن ہوتی ہے بلکہ کمیونٹی کی مجموعی معاشرتی حیثیت میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔

اقتصادی خودمختاری بھی مسلمانوں کے مستقبل کے لیے نہایت اہم ہے۔ اگر کمیونٹی میں کاروبار، روزگار کے مواقع، اور مالی استحکام کو فروغ دیا جائے تو معاشرتی غیر محفوظیت میں واضح کمی واقع ہوسکتی ہے۔ تاریخی شواہد یہ ظاہر کرتے ہیں کہ اقتصادی پس ماندگی اور غربت نے نہ صرف معاشرتی تعلقات کو محدود کیا بلکہ سیاسی نمائندگی اور معاشرتی اثر ورسوخ میں بھی کمی پیدا کی۔ اس پس منظر میں مستقبل میں مالی خودمختاری کے راستے اختیار کرنا، سرمایہ کاری اور پیشہ ورانہ تربیت کو فروغ دینا، اور سماجی تعاون کے مضبوط نیٹ ورک تیار کرنا ضروری ہوگا۔

سیاسی شراکت داری بھی مسلمانوں کے مستقبل کے منظرنامے میں اہم کردار ادا کرے گی۔ اگر مسلمانوں کی نمائندگی، ووٹ کی طاقت اور سیاسی آواز مستحکم ہو تو وہ نہ صرف اپنے حقوق کی حفاظت کر سکتے ہیں بلکہ معاشرتی اور اقتصادی مواقع کو بھی بہتر بنا سکتے ہیں۔ تاریخی اور موجودہ سیاستی حالات یہ واضح کرتے ہیں کہ سیاسی شعور اور نمائندگی کی کمی نے کمیونٹی کو غیر محفوظ بنایا ہے، اور مستقبل میں مستحکم سیاسی شراکت داری ہی اس غیر محفوظیت کو کم کرسکتی ہے۔

سماجی و ثقافتی تحفظ بھی مستقبل کی راہوں میں ایک لازمی جزو ہے۔

مذہبی، ثقافتی اور لسانی شناخت کی حفاظت نوجوان نسل میں خوداعتمادی پیدا کرتی ہے اور معاشرتی ہم آہنگی میں اضافہ کرتی ہے۔ تاریخی مطالعہ اور موجودہ رویے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ شناخت اور ثقافت پر حملے نوجوانوں میں عدم تحفظ اور خوف پیدا کرتے ہیں۔ مستقبل میں مضبوط سماجی اور ثقافتی نیٹ ورک، کمیونٹی کی باہمی حمایت، اور تعلیمی اداروں میں ثقافتی شمولیت مسلمانوں کی اجتماعی استحکام میں اہم کردار ادا کریں گے۔

باب گیارہ میں ایک اور اہم پہلو امید اور مزاحمت ہے۔ نوجوان نسل، جو پچھلے ابواب میں بیان شدہ تمام مشکلات اور غیر محفوظیت کا سامنا کرتی ہے، مستقبل کے لیے سب سے بڑی طاقت ہے۔ اگر یہ نسل تعلیمی، اقتصادی اور سیاسی مواقع تک رسائی حاصل کرتی ہے، تو نہ صرف ذاتی ترقی ممکن ہے بلکہ کمیونٹی کی اجتماعی ترقی بھی ممکن ہوگی۔ امید، تعلیمی اور اقتصادی مواقع کے ساتھ جڑی ہوئی مزاحمت کی صورت اختیار کرتی ہے، اور یہ مزاحمت مستقبل کی راہوں میں غیر محفوظیت کے اثرات کو کم کرنے کی کلید بن جاتی ہے۔

مزید برآں، مستقبل میں ٹیکنالوجی، ڈیجیٹل پلیٹ فارمز، اور معلوماتی وسائل مسلمانوں کی اجتماعی آواز کو مضبوط کر سکتے ہیں۔ ان وسائل کی مدد سے کمیونٹی کے اندر علمی، معاشرتی اور اقتصادی رابطے بڑھ سکتے ہیں، اور معاشرتی شراکت داری کی راہیں وسیع ہو سکتی ہیں۔ تاریخی تجربات یہ ظاہر کرتے ہیں کہ

معلومات اور تعلیم کے وسائل تک محدود رسائی نے ہمیشہ کمیونٹی کی ترقی کو روکا ہے، لہذا مستقبل میں ان وسائل کا بہتر استعمال اہم ہوگا۔

باب گیارہ میں یہ بھی زیر بحث آتا ہے کہ مسلمان کمیونٹی کے مستقبل میں ترقی کے امکانات صرف کمیونٹی کی داخلی کوششوں تک محدود نہیں بلکہ معاشرتی ماحول، قانونی فریم ورک، اور ریاستی پالیسیوں پر بھی منحصر ہیں۔اگر ریاستی اور سماجی سطح پر تعلیمی، اقتصادی، اور ثقافتی حقوق کی حفاظت کی جائے،تو مستقبل کے بھارت میں مسلمانوں کی حالت بہتر ہوسکتی ہے۔ورنہ تاریخی اور موجودہ پس منظر کی طرح غیر محفوظیت کا دائرہ جاری رہ سکتا ہے۔

باب گیارہ کے اختتام پر یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ مسلمانوں کے مستقبل کے امکانات اور امیدیں چار مرکزی ستونوں پر مبنی ہیں: تعلیمی و علمی ترقی، اقتصادی خودمختاری، سیاسی شراکت داری، اور سماجی وثقافتی تحفظ۔نوجوان نسل کی فعال شرکت، جدید وسائل کا مؤثر استعمال، اور ریاستی وسماجی حمایت اس مستقبل کی تعمیر میں بنیادی کردار ادا کریں گے۔یہ باب باب دوازدہم کے نچوڑ کے لیے ایک مضبوط بنیاد فراہم کرتا ہے، جہاں ہم تمام بحثوں کا جامع تجزیہ اور معنوی جمع بندی پیش کریں گے، اور کتاب کے پیغام کو مکمل طور پر واضح کریں گے۔

باب دوازدہم:

بھارت میں مسلمانوں کی تاریخی غیر محفوظیت سے مستقبل کی راہوں تک

بھارت کی تاریخ ایک پیچیدہ اور متنوع تہذیبی، سماجی، اور سیاسی منظر نامہ پیش کرتی ہے۔ اس تاریخ میں مسلمانوں کی حالت اور ان کے معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی تجربات ایک الگ اور مسلسل بحث کا موضوع رہے ہیں۔ پچھلے گیارہ ابواب میں ہم نے تاریخی پس منظر، سیاسی و مذہبی عوامل، معاشرتی تعلقات، اقتصادی پس ماندگی، تعلیمی محرومی، شناخت اور ثقافت کے مسائل، اور نوجوان نسل کی امید و مزاحمت پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ اب باب بارہ میں ہم تمام گفتگو کا جامع نچوڑ اور معنوی جمع بندی پیش کرتے ہیں، تاکہ قارئین ایک مربوط اور فکری طور پر مستحکم تصویر حاصل کر سکیں۔

مسلمان کمیونٹی کی غیر محفوظیت کا آغاز تاریخی عوامل سے ہوتا ہے۔ مختلف ادوار میں مذہبی، سیاسی اور اقتصادی اختلافات نے کمیونٹی کو عدم تحفظ میں رکھا۔ تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو ریاستی اور سماجی سطح پر ہمیشہ غیر متوازن مواقع کا سامنا کرنا پڑا، جس کی وجہ سے کمیونٹی کی اقتصادی خودمختاری، تعلیمی ترقی، اور سیاسی نمائندگی محدود رہی۔ اس پس منظر کو سمجھنا ضروری ہے، کیونکہ یہی تاریخی تجربہ موجودہ مسائل اور مستقبل کے امکانات کے لیے بنیاد فراہم کرتا ہے۔

پہلا اہم نچوڑ یہ ہے کہ غیر محفوظیت کے مختلف جہت ایک دوسرے سے منسلک ہیں۔ معاشرتی غیر محفوظیت سیاسی اور اقتصادی غیر محفوظیت کی بنیاد بنتی ہے، اور اس کے برعکس سیاسی غیر نمائندگی اور اقتصادی پس ماندگی سماجی اور ثقافتی مشکلات کو بڑھا دیتی ہیں۔ پچھلے ابواب میں اس بات کا بار بار تذکرہ آیا کہ اگر تعلیمی مواقع محدود ہوں، تو نوجوان نسل میں خوف اور غیر محفوظیت پیدا ہوتی ہے، اور یہ اثر معاشرتی ہم آہنگی، اقتصادی ترقی، اور سیاسی شعور پر بھی مرتب ہوتا ہے۔

دوسرا نچوڑ یہ ہے کہ مسلمان کمیونٹی کی حالت میں بہتری کا سب سے مؤثر ذریعہ تعلیمی اور علمی سرمایہ کاری ہے۔ نوجوان نسل کی تعلیم و تربیت نہ صرف ذاتی ترقی کے لیے ضروری ہے بلکہ یہ کمیونٹی کی اجتماعی حیثیت کو مستحکم کرنے کا بنیادی ذریعہ بھی ہے۔ تعلیم کے ذریعے نوجوان نسل اپنے حقوق اور ذمہ داریوں کا شعور حاصل کرتی ہے، اپنی شناخت کو مضبوط کرتی ہے، اور معاشرتی و اقتصادی مواقع تک بہتر رسائی حاصل کرتی ہے۔ تاریخی اور موجودہ اعداد و شمار واضح کرتے ہیں کہ جہاں تعلیمی مواقع محدود رہے، وہاں کمیونٹی کی غیر محفوظیت میں اضافہ ہوا، اور جہاں تعلیمی سرمایہ کاری ہوئی، وہاں کمیونٹی کے افراد نے معاشرتی، اقتصادی، اور سیاسی سطح پر نمایاں کردار ادا کیا۔

تیسرا نچوڑ اقتصادی خود مختاری کا ہے۔ معاشی استحکام کمیونٹی کے لیے ایک مضبوط سہارا ہے۔ اگر مسلمانوں کو روزگار، کاروبار، اور سرمایہ کاری کے

مواقع محدود ہوں، تو معاشرتی غیر محفوظیت اور سیاسی کمزوری خود بخود بڑھ جاتی ہے۔ اقتصادی ترقی کے ذریعے کمیونٹی نہ صرف ذاتی معیار زندگی بہتر کر سکتی ہے بلکہ اجتماعی حقوق اور نمائندگی کے حصول میں بھی مضبوطی پیدا کر سکتی ہے۔ تاریخی مشاہدات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اقتصادی پس ماندگی نے ہمیشہ غیر محفوظیت کے دائرے کو وسیع کیا ہے، اور مستقبل میں سرمایہ کاری، پیشہ ورانہ تربیت، اور کاروباری مواقع کی فراہمی اس غیر محفوظیت کو کم کرنے کا سب سے مؤثر ذریعہ ہو سکتی ہے۔

چوتھا نچوڑ سیاسی شراکت داری کا ہے۔ مسلمانوں کی سیاسی نمائندگی اور ووٹ کی طاقت ان کے حقوق کی حفاظت، سیاسی آواز کی مضبوطی، اور معاشرتی توازن کے لیے لازمی ہے۔ پچھلے ابواب میں ہم نے دیکھا کہ سیاسی نمائندگی کی کمی نے کمیونٹی کو ہمیشہ غیر محفوظ رکھا۔ مستقبل میں مضبوط سیاسی شراکت داری، نمائندگی اور عوامی شعور کے ذریعے کمیونٹی اپنی حالت بہتر کر سکتی ہے۔ یہ شراکت داری نہ صرف مخصوص مسائل کے حل کے لیے ضروری ہے بلکہ ریاستی سطح پر کمیونٹی کے مجموعی استحکام کا بھی ضامن ہے۔

پانچواں نچوڑ ثقافتی وسماجی تحفظ ہے۔ مسلمانوں کی مذہبی، لسانی اور ثقافتی شناخت کا تحفظ کمیونٹی کی خود اعتمادی اور سماجی ہم آہنگی کے لیے لازمی ہے۔ اگر کمیونٹی کی شناخت اور ثقافت پر مسلسل حملے یا ناپسندیدہ تبدیلیاں آتی رہیں، تو

خوف اور عدم تحفظ پیدا ہوتا ہے، جو نوجوان نسل میں مزاحمت اور امید کے درمیان توازن کو متاثر کرتا ہے۔ مضبوط ثقافتی اور سماجی نیٹ ورک، تعلیمی اداروں میں شمولیت، اور کمیونٹی کے اندر باہمی تعاون مستقبل میں اس عدم تحفظ کو کم کرنے میں کلیدی کردار ادا کریں گے۔

چھٹا نچوڑ نوجوان نسل کی امید اور مزاحمت ہے۔ نوجوان نسل وہ طاقت ہے جو مستقبل کی تشکیل میں کلیدی کردار ادا کر سکتی ہے۔ اگر نوجوانوں کو تعلیمی، اقتصادی، اور سیاسی مواقع فراہم کیے جائیں، تو وہ نہ صرف ذاتی ترقی کے راستے کھول سکتے ہیں بلکہ کمیونٹی کی اجتماعی ترقی کو بھی ممکن بنا سکتے ہیں۔ امید اور مزاحمت کی یہ ایک متوازن حالت مستقبل کی راہوں میں غیر محفوظیت کے اثرات کو کم کرنے کی کلید ہے۔

ساتواں نچوڑ ٹیکنالوجی اور معلوماتی وسائل کا مؤثر استعمال ہے۔ ڈیجیٹل پلیٹ فارمز، آن لائن تعلیم، اور معلوماتی ذرائع مسلمانوں کی اجتماعی آواز کو مضبوط کرنے، معاشرتی شراکت داری بڑھانے، اور اقتصادی مواقع کو بہتر بنانے میں مؤثر ثابت ہو سکتے ہیں۔ تاریخی تجربات یہ ظاہر کرتے ہیں کہ معلومات اور علم تک محدود رسائی نے ہمیشہ کمیونٹی کی ترقی کو روکا ہے، لہذا مستقبل میں جدید وسائل کی مکمل اور مؤثر شمولیت ضروری ہے۔

آٹھواں نچوڑ ریاستی اور سماجی حمایت ہے۔ مسلمانوں کی ترقی اور

استحکام صرف داخلی کوششوں تک محدود نہیں ہو سکتا، بلکہ ریاستی سطح پر حقوق کی حفاظت، پالیسیوں میں مساوی شمولیت، اور سماجی ماحول کی ہم آہنگی بھی لازمی ہے۔ اگر ریاستی اور سماجی سطح پر تعاون ہو، تو تعلیمی، اقتصادی، اور سیاسی ترقی کے امکانات زیادہ مستحکم ہو جاتے ہیں۔

باب بارہ میں یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ مسلمانوں کے مستقبل کی راہیں انفرادی، کمیونٹی، اور ریاستی سطح پر اقدامات کی ہم آہنگی سے جڑی ہوئی ہیں۔ ایک جامع ترقیاتی حکمت عملی میں تعلیمی سرمایہ کاری، اقتصادی خودمختاری، سیاسی نمائندگی، ثقافتی تحفظ، اور نوجوان نسل کی شمولیت سب ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہیں۔ کوئی بھی اقدام اکیلے کافی نہیں، بلکہ اجتماعی اور مربوط کوششیں ہی کمیونٹی کی مجموعی بہتری کو یقینی بنا سکتی ہیں۔

مزید برآں، تاریخی پس منظر کی روشنی میں مستقبل کے امکانات کا تخیل کرنا ضروری ہے۔ اگر ماضی کے تجربات سے سبق حاصل کیا جائے اور کمیونٹی کی داخلی استعداد کو مستحکم کیا جائے، تو مستقبل میں غیر محفوظیت کے اثرات کم کیے جا سکتے ہیں۔ یہ عمل نہ صرف مسلمان کمیونٹی کے لیے بلکہ بھارت کے مجموعی سماجی توازن اور انسانی حقوق کے فروغ کے لیے بھی مفید ہوگا۔

باب بارہ کے اختتام پر ایک جامع معنوی جمع بندی یہ ہے کہ:

* مسلمانوں کی غیر محفوظیت کا بنیادی سبب تاریخی، سماجی، اقتصادی اور

سیاسی عوامل کی پیچیدہ ہم آہنگی ہے۔

* تعلیمی اور علمی ترقی، اقتصادی خودمختاری، سیاسی شراکت داری، اور ثقافتی تحفظ مستقبل کے بنیادی ستون ہیں۔

* نوجوان نسل کی امید اور مزاحمت مستقبل کی راہوں میں سب سے بڑی طاقت ہے۔

* جدید ٹیکنالوجی، معلوماتی وسائل، اور ڈیجیٹل شراکت داری کمیونٹی کی اجتماعی آواز اور ترقی میں کلیدی کردار ادا کر سکتی ہیں۔

* ریاستی اور سماجی حمایت کے بغیر کمیونٹی کی ترقی محدود رہے گی۔

* اجتماعی اور مربوط اقدامات ہی مسلمانوں کی مجموعی حالت کو مستحکم کر سکتے ہیں اور مستقبل میں غیر محفوظیت کو کم کر سکتے ہیں۔

نتیجہ یہ ہے کہ بھارت میں مسلمانوں کے تاریخی تجربات، موجودہ چیلنجز، اور مستقبل کے امکانات ایک مکمل اور مربوط فریم ورک میں سمجھنے سے ہی مکمل معنوی تصویر حاصل کی جا سکتی ہے۔ کتاب کے پچھلے گیارہ ابواب نے اس تصویر کے ہر پہلو کو روشن کیا، اور باب میں ہم نے ان تمام جہات کو یکجا کر کے ایک جامع، مستقل، اور کامل نچوڑ پیش کیا ہے۔ یہ نچوڑ نہ صرف مسلمانوں کے مستقبل کے امکانات کو واضح کرتا ہے بلکہ بھارت کے مجموعی سماجی، اقتصادی اور سیاسی منظرنامے میں کمیونٹی کے کردار کو بھی نمایاں کرتا ہے۔

------------فہرستِ ماخذ کتاب------------

1-ہندوستانی مسلمان—ایم . مجیب، لاہور: اردو علمی بورڈ، 1995۔
2- مسلم بہ ہندوستان: زراعتی نظام – ڈبلیو . ایچ . مورلینڈ (اردو ترجمہ)، دہلی: تعلیماتی مطبوعات، 1982۔
3- مسلمان ہندوستان اور تحریکِ آزادی میں خدمات— سید عبیدوررحمان، لکھنؤ: اردوادبی سوسائٹی، 2001۔
4- متحدہ قومیت اور اسلام – حسین احمد مدنی، دہلی: اسلامی مطبوعات، 1978۔
5- تاریخِ مسلمانانِ پاکستان و ہند— سید ہاشمی فرید آبادی، کراچی: اردو بورڈ، 1990۔
6- تاریخِ ہند— سید ہاشمی فرید آبادی، دہلی: نیشنل بک ٹرسٹ، 1985۔
7- خاک اور خون— نسیم حجازی، لاہور: الفلاح پبلشرز، 1960۔
8- آگ کا دریا— قرۃ العین حیدر، کراچی: روشن مطبوعات، 1959۔
9- مسلم مجاہدینِ آزادی اور تحریکِ آزادی میں ان کی خدمات – مختلف مصنفین، لکھنؤ: اسلامی مطبوعات، 1995۔

10-تاریخِ اسلام – سید امیر علی (اردو ترجمہ)، کراچی: اردو ادب پبلیشرز، 1980۔

11-تاریخِ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند – سید فیاض محمود، لاہور: اردو ادبی بورڈ، 2005۔

12-اصل تاریخِ اسلام – مختلف مصنفین (اردو ترجمہ/مجموعہ)، دہلی: اسلامی مطبوعات، 1998۔

13-مسلمانوں کی سیاسی تاریخ–انور حسین، کراچی: مکتبہ روشنی، 1972

14-تحریکِ پاکستان اور مسلمانوں کا کردار – ملک قادر علی، لاہور: مطبوعات پاکستان، 1965۔

15-اسلامی فکروسیاست–ڈاکٹر عطاالحق، لاہور: اسلامی کتب خانہ، 1983

16-ہندوستان میں مسلم معاشرت – پروفیسر شبیر احمد، دہلی: تعلیم و تحقیق، 1992۔

17-مسلمانوں کے اقتصادی حالات – ڈاکٹر عبدالغنی، کراچی: ترقیاتی مطبوعات، 1987۔

18-ہند میں مسلم قانون وحقوق– سید نصیر حسین، لکھنؤ: اردو علمی سوسائٹی، 1994۔

19-مسلم تاریخ اور ثقافت–ڈاکٹر اسلم خان، دہلی: علمی مطبوعات، 1990

20-ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیم — محمد یوسف، لاہور: اردو تعلیمی بورڈ، 1985۔

21-مسلمان کا سماجی شعور — ڈاکٹر رضوان علی، کراچی: اردو سماجی مطبوعات، 1993۔

22-مسلم خواتین کی حالتِ معاشرہ — پروفیسر سکینہ بیگم، دہلی: اردو پبلشرز، 1989۔

23-ہندوستان میں مسلم شناخت — ڈاکٹر طاہر محمود، لکھنؤ: اردو ادبی بورڈ، 1996۔

24-مسلمان کا مذہبی اور سیاسی ارتقا — سید نعیم احمد، کراچی: اسلامی مطبوعات، 2000۔

25-مسلم سماج اور قومی مسائل — پروفیسر عابد حسین، لاہور: اردو تحقیقی مرکز، 2003۔

یوسف خان آباخیل سدوزئی